ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اپریل ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۱۰ | شعبان ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبر شپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبر شپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	مومن کو کیسے چلنا چاہیے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	
۲-	اداریہ	احتجاج سے نتائج تک	مدیر	۳
۳-	عالم اسلام	عجب چیز ہے لذت آشنائی	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۷
۴-	فکر و تدبر	نہی عن المنکر سے پہلوتہی بھی زوالِ امت کا ایک بڑا سبب	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۱۳
۵-	اسلامی تعلیمات	وبائی امراض کی حقیقت اور اسلامی تعلیمات	محمد عارف باللہ القاسمی	۱۸
۶-	// //	توکل وتدبیر کی اہمیت؛ حقائق کے آئینے میں	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۲۱
۷-	ذکر حبیب	معراج کا واقعہ اور اس کا سبق	محمد قمر الزماں ندوی	۲۶
۸-	نقد و نظر	فرہنگ نعت وسیرت (محبوب ومحبّ)	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۳۰
۹-	تعلیم و تربیت	نوعمر بچوں کا نظم ونسق پر توجہ نہ دینا	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۸
۱۰-	منصوبہ بندی	اسوۂ حسنہ کا ایک اہم پہلو	محمد سہیل ندوی	۴۴
۱۱-	مطالعات	مولانا حفظ الرحمٰن اور سیرت رسول کریم ﷺ	محمد ساجد	۴۷
۱۲-	تحریک عمل	چار اہم سوال؟	سید احمد ومیض ندوی	۵۱
۱۳-	شریعت و قانون	اسلام میں جرم وسزا کا تصور	محمد اشتیاق علی	۵۶
۱۴-	تأثرات	دار الصلح والخیر، گودھرا	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶۱
۱۵-	خبریں	وزیر داخلہ کے بیان پر — ترمیم کے عوامی مطالبات	(ادارہ)	۶۳
۱۶-	گوشۂ ادب	بچھاتے کیوں ہو شمع آرزو کو جھلملانے دو	کلیم عاجز	۶۴
۱۷-	درسِ حدیث	وباؤں سے بچنے کے لیے حضورؐ کی احتیاطی تدابیر	محمد سہیل ندوی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

احتجاج سے نتائج تک

ملک کے طول وعرض پر بھارت کے لوگ بالخصوص مسلمان سڑکوں پر ہیں، ان میں بھی خواتینِ خانہ کا کردار زیادہ نمایاں ہے، حکومتِ وقت نے معاملہ کو کچھ اس طرح طول دیا ہے کہ گویا ان احتجاجات سے اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، عدالت عظمیٰ کا رویہ بھی صاف طور پر حکومت کی منشا کے تابع نظر آتا ہے، ورنہ اب تک معاملہ حل ہو چکا ہوتا، ایک طرف ملک غیر علانیہ معاشی ایمرجنسی سے گذر رہا ہے دوسری طرف تقریباً تین ماہ سے ایسی مضطرب صورت حال ہے جس سے عام زندگی انتشار کا شکار ہے، معمولاتِ زندگی کا ان حالات سے متاثر ہونا اور معیشت پر اثر انداز ہونا یقینی امر ہے۔

اسی دوران شمال مشرقی دہلی کے فسادات بلکہ منظّم ومنصوبہ بند مسلم کش حملوں کے سبب حالات مزید سنگین ہو گئے، لیکن تحریک پھر بھی جاری ہے، اسی دوران پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہوا جس میں یہ موضوعات زیر بحث آئے، مگر صورت حال ہنوز کسی نتیجہ پر پہنچتی نظر نہیں آتی، سب سے مایوس کن جو بات ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو ان کی اعلیٰ سطحی قیادت نے ایسے وقت میں بے سہارا چھوڑا ہے، جبکہ ملت کی کشتی بھنور میں پھنسی ہے، آزادی کے بعد سے ایسے سخت حالات کبھی نہ آئے تھے، حکومت مسلم دشمنی اور ہندو راشٹر کے اپنے ایجنڈے پر قائم اور عمل پیرا ہے، مسلم عوام سڑکوں پر مقابلہ آرا ہیں، مسلم قیادت نے سپر ڈال دی ہے، یا انھیں مصلحتوں نے خاموش کر دیا ہے، قومی یکجہتی کا بوجھ ڈھونے والے اب بھی اس بوجھ کو ڈھونے بلکہ قاتلوں کو قومی یکجہتی کا علمبردار منوانے پر بضد ہیں، ان حالات میں بہت اچھی طرح سیاہ وسفید کی پہچان ہو رہی ہے، حالات اور آزمائشیں تو آتی ہی ہیں اس لیے کہ کھرے اور کھوٹے کی شناخت ہو جائے، حالات پر نوحہ گری اور مرثیہ خوانی کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ روشنی کے پھیلنے کے لیے ظلمت کا وجود ضروری ہے۔

فضائے زندگی کی ظلمتوں کے مرثیہ خوانو
اندھیروں ہی کے دم سے امتیاز نور ہوتا ہے

یہی وجہ ہے کہ ہم ان مشکل حالات میں بھی مایوس ہرگز نہیں، صبحِ روشن طلوع ہوگی، ضرور ہوگی، یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس کے طلوع کی فضا ہموار کرنے میں ہمارا حصہ ہوگا یا نہیں اور ہم اس روشنی سے مستفید ہوں گے یا نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت اور سپریم کورٹ نے مسئلہ کو بہت طول دیا، تاکہ تحریک خود ہی ٹوٹ جائے، بلکہ توڑنے کے لیے اس نے منظّم کوششیں کیں، گولیاں چلانے والے بھیجے، تشدد کرایا، لوگوں کو بھڑکایا، فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی، بھونڈے اور بھدے الزامات لگائے اور بالآخر شمال مشرقی دہلی کو تشدد و فساد کی آگ میں جھونک دیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ حکومت وقت کے سب حربے ناکام ہوئے، یہ صحیح ہے کہ فسادات میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵۳/ جانیں گئیں اور تقریباً ۲۵/ ہزار کروڑ کی املاک تباہ ہوئی، سینکڑوں خاندانوں کی دنیا اجڑ گئی، کئی مساجد جلا دی گئیں، مگر فسادات کے کلیدی ذمہ دار مسٹر امت شاہ کو یہ احساس جلد ہی یہ ہوگیا کہ وہ راجدھانی دہلی کو گودھرا کے اطراف سمجھنے کی بھول کر رہے ہیں، سوشل میڈیا کے دور کو 2002 کا دور سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں، انھیں یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اب کوئی بھی فریق صرف مرنے کے لیے لقمۂ تر بننے کو تیار نہیں، ان کو یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ ہندو مسلم عوام کی اکثریت آپس میں لڑنے کو تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس فساد میں تقریباً ۲۰ ہندوؤں کی بھی جانیں گئیں، یہ لوگ بھی زخمی ہوئے، آپس میں لوگوں نے ایک دوسرے کو بچانے کی کوششیں بھی کیں جس کی متعدد مثالیں سامنے آئیں، فسادات کے لیے جو تربیت یافتہ غنڈے آئے تھے ان کا اعتراف وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں کیا، یہ وہ اسباب تھے جن کے سبب یہ فساد جلد رک گیا، وزیر داخلہ نے جو صفائی پیش کی اور پولیس کی پیٹھ تھپتھپائی وہ سراسر جھوٹ ہے، درحقیقت مذکورہ بالا اسباب نے فسادات پر قابو پایا ورنہ پولیس تو فسادیوں کی کھلے عام پشت پناہی کر رہی تھی، یہ پہلا موقع تھا جب عالمی میڈیا نے ''ہندتوا'' کے جنون کی جم کر خبر لی، اس سے پہلے بھارت کے کسی بھی مسلم کشی فساد کو عالمی میڈیا نے اس قدر موضوع بحث نہیں بنایا گیا تھا، سب سے پہلے اردوغان نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، پھر ایران کے وزیر خارجہ نے سخت بیان دیا، پھر ایران کے سپریم لیڈر نے تیکھا تبصرہ کیا، بی بی سی، الجزیرہ، نیویارک ٹائمس، واشنگٹن پوسٹ اور عرب ۲۱ وغیرہ نے مفصل رپورٹ شائع کیں اور حقیقت پسندانہ تبصرے کیے۔

راجیہ سبھا میں وزیر داخلہ کا انداز گفتگو، لب و لہجہ اور باڈی لینگویج سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ پریشر میں ہیں، عالمی منظر نامہ پر ان کی حکومت سوالات کے گھیرے میں ہے، اندرون ملک مختلف طبقات، مختلف مسائل کو لے کر سراپا احتجاج ہیں، یو این ہیومن رائٹ کمیشن سی اے اے کے خلاف سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، دوست ممالک میں بھی منفی تبصرے ہو رہے ہیں، عوام کو غیر ضروری مسائل میں گمراہ کرنے اور الجھانے کی ہزار کوششوں کے باوجود کھوکھلی ہوتی اور گرتی ہوئی

معیشت کے راز کھل رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے بار بار بڑی لجاحت سے اپوزیشن لیڈران کو یہ کہتے ہوئے بات چیت کے لیے مدعو کیا کہ بہت ہوا سی اے اے این پی آر، اب اس کو بند کر دینا چاہیے، میں بات چیت کے لیے تیار ہوں، آیئے ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں، اس کا مطلب صاف تھا کہ کئی بوتل کا نشہ کچھ ہلکا ہوا ہے، ظالم نے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھائی تھی مگر وہ کئی فٹ پیچھے ہٹنے کی راہیں تلاش کر رہا ہے، وہ مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے مگر انا روکتی ہے اور پھر وہ ماحول بھی روکتا ہے جو خود اس نے تیار کیا ہے، اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بی جے پی نے اپنی شناخت مسلم دشمن اور ہندو راشٹر کے زمان کے طور پر بنائی ہے، کوئی کچھ بھی کہے مگر ایک مخصوص طبقہ اسی وجہ سے اس کی ہر غلطی کو نظر انداز کر کے اس کو سپورٹ کرتا ہے، اس لیے بی جے پی سیدھے سیدھے کبھی بھی مسلمانوں سے بات نہیں کرے گی، وہ قطعی اپنے بھرم کو قائم رکھنے اور اس مخصوص طبقہ پر گرفت باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی، البتہ بری طرح سے گھر جانے کے بعد وہ کمالِ چالاکی سے مسائل کو وقتی طور پر حل ضرور کرنا چاہے گی، اسی لیے وزیر داخلہ کا بیان سن کر راقم نے فوری طور پر یہ لکھا تھا کہ وزیر داخلہ نے اب پورے طور پر گیند اپوزیشن کے پالے میں ڈال دی ہے، اگر اپوزیشن وزیر داخلہ کے اس آن ریکارڈ بیان کو ''قانونی دستاویز'' کی شکل دلانے میں ناکام ہوتی ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اپوزیشن حکومت سے زیادہ نکمّی بلکہ سازش میں برابر کی شریک ہے، اپوزیشن کو چاہیے کہ وہ این پی آر کے سٹیزن شپ رول ۲۰۰۳ کی شق ۳، ۴، ۵ کو ختم کرائے بلکہ اس سلسلہ میں الائنس (Alliance against CAA, NRC, NPR) کے مطالبات کی روشنی میں مسئلہ کے حل تک پہنچنے کی کوشش کرے، وزیر داخلہ کے محض الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں، یوں بھی گذشتہ تین چار مہینوں میں انھوں نے تضاد بیانی کا عالمی رکارڈ قائم کیا ہے، ان کے محض بیان پر کسی خوش فہمی کا شکار ہونا بھولا پن ہے، حالات کا تجزیہ کرتے وقت حکومت کی کارکردگی، حکمراں جماعت کے ایجنڈے، عوام کے مطالبات اور صورت حال کے تقاضوں کا صحیح تجزیہ ہی عوام کے سامنے رکھنا چاہیے، البتہ عوام کو بھی سوشل سائنس پر چوطرفہ حالات وتقاضوں پر نظر کیے بغیر بازاری تبصروں سے گریز کرنا چاہیے، یہ سچ ہے کہ کسی بھی مسئلہ کا حل صرف اور صرف بات چیت سے ہی نکل سکتا ہے، مگر جو حالات پیدا ہوئے ہیں ان میں تحریک کو ٹوٹنے سے بچانا ہماری پہلی ذمہ داری ہے، جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر مسئلہ کے حل اور کسی نتیجہ تک پہنچنا دوسری ذمہ داری ہے، اور اس تحریک کے نتیجہ میں تازہ دم، جاں پرسوز، اسلام پسند اور شاہین صفت قیادت کی تشکیل تیسری سب سے اہم ذمہ داری ہے، واقعہ یہ ہے کہ طاقت ور اور کامیاب احتجاجی تحریک کے باوجود ان تینوں سطح پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ پیش رفت اور نتیجہ خیز حکمت عملی تک ہم پہنچنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، بات چیت کا دروازہ یوں بھی کبھی بھی کسی کے لیے بند نہیں کرنا چاہیے، اس ملک میں آزادی کے بعد سے ہماری ناکام

پالیسیوں کا یہ حصہ رہا کہ ہم نے ایک طبقہ کو دوست بنایا اور دوسرے کو دشمن، ایک کی نوازشوں کا دم بھرتے رہے اور دوسرے سے نفرتیں عام کرتے رہے، جبکہ دونوں ہی ہمارے وجود سے فائدہ اٹھاتے رہے اور استحصال کرتے رہے، ایک نے ہمیں بے وقوف بنا کر دوستی کی اور فائدہ اٹھایا، دوسرے نے ہمیں دشمن بتا کر فائدہ اٹھایا، جبکہ کامیاب حکمت عملی یہ تھی کہ ہم کسی کے نہ ہوتے اور سب ہمارے ہوتے، بھارت جیسی ساخت والے ملک میں موقع پرستی کی سیاست کا بڑا اہم کردار ہے، ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے اب نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے کہ ہم ماضی میں شکار ہوئے ہیں اور ہمارا خوب استحصال ہوا ہے، ملک میں موجود فرقہ ورانہ رنگ کو فروغ دینے میں بڑی حد تک ہماری کوتاہیوں اور غلط پالیسیوں کا بھی کردار رہا ہے۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ اس طوفان سے نکلنا ہے جس کے لیے سطور بالا میں پیش کی گئی حکمت عملی کو اپنانا لازمی ہے، ساتھ ہی یہ ذہن میں رہے کہ اگر حکومت اسی طرح اپنی ضد پر اڑی رہتی ہے تو NPR کے بائیکاٹ کے ملی فیصلہ پر عمل کرنا ضروری ہے، اس فیصلہ میں جو بھی اگر مگر کا شکار ہو اس کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر شخص کو اپنے حلقۂ اثر اور پاس پڑوس کے لوگوں کو NPR کے مضمرات و مضرتوں سے آگاہ کرنا اور بائیکاٹ کے لیے تیار کرنا ہے، یاد رکھیے NPR میں حکومت کے ساتھ عدم تعاون میں صرف کچھ موہوم خدشات ہیں لیکن NPR میں شرکت کے سبب تباہی و بربادی و ہلاکت خیزی یقینی ہے، موہوم خدشات پر واویلا کرنے والے دراصل مسئلہ کی گہرائی سے واقف ہی نہیں ہیں، اور پھر یہ سمجھنے کی بات ہے کہ کسی بڑی تبدیلی کے لیے کچھ نہ کچھ خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں، ۱۱ ریاستوں نے اب تک اس مسئلہ پر مرکزی حکومت کی مخالفت کی ہے، جن ریاستوں میں حکومت نے مخالفت نہیں کی وہاں اگر ۱۵ ربیں فیصد عوام بھی بائیکاٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مرکزی حکومت کی یہ پالیسی ناکام اور غیر موثر ہوگی، لیکن یہ یاد رکھیے اس موڑ پر اگر حکومت اپنی پالیسی کے نفاذ میں کامیاب ہوگئی تو پھر آئندہ بڑے خوفناک حالات پیدا ہوں گے اور اس کی ذمے داری ان لوگوں پر عائد ہوگی جو سیادت تو چاہتے ہیں مگر مسائل کے حل سے بھاگتے ہیں یا انتہائی نازک حالات میں بھی پس وپیش میں رہتے ہیں اور عوام کو حتمی رائے دینے اور واضح رہنمائی کرنے کے بجائے کنفیوزن میں مبتلا کرتے ہیں۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ عالم اسلام

عجب چیز ہے لذت آشنائی

(طالبان امریکہ معاہدہ کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

دنیا جانتی ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر غیر ملکی طاقتیں کبھی ٹھہر نہ سکیں، افغانیوں کی غیرت دینی نے کبھی بھی سپر نہ ڈالی، اس مرتبہ تو اقبال کی بات صد فیصد صادق آئی، امریکہ درجنوں طاغوتی طاقتوں کے اتحاد کے ساتھ چلا تھا ''مُلّا کو کوہ و دمن سے نکال کر افغانیوں کی غیرت دینی کا علاج کرنے''، مگر مُلّا نے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں اپنے بے باکانہ خطاب میں کہہ دیا تھا کہ ''اے امریکیو! تم آجاؤ، میں بھی دیکھتا ہوں تم کس طرح آتے ہو اور جب تم آجاؤ گے تو اپنا انجام بھی دیکھو گے''، ملا عمر نے اس وقت یہ تاریخی جملہ بھی اپنی زبان سے ادا کیا تھا جو عظیم فاتحین ومجاہدین کے اقوال ماثورہ کے درمیان پوری شان سے تا قیامت چمکتا رہے گا ''میں مسلمانوں کے لیے اپنی زندگی میں ایسی کوئی چیز چھوڑ کر نہ جاؤں گا جو مسلمانوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہو'' اور سچ ہی تو کہا تھا انھوں نے، جب ساری دنیا سے مسلمانوں کی ذلت وشکست کی خبریں آرہی تھیں تو افغانی ملاؤں کو اللہ تعالیٰ فتح ونصرت سے نواز رہا تھا، معرفتِ حق کی لذت سے آشنا ہو کر انھوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس پہ چل کر وہ منزل مقصود تک پہنچ رہے تھے بلکہ کامیابی کی ایک منزل طے کر رہے تھے، ان کی مومنانہ ٹھوکروں سے عالمی طاقتیں دو نیم ہو رہی تھیں، ان کی ہیبت سے بہت سی جبروتی طاقتوں پر لرزہ طاری ہو رہا تھا، ۲۹ر فروری ۲۰۲۰ء کو جس وقت دوحہ کے کانفرنس ہال میں نعرۂ تکبیر بلند ہو رہا تھا، اس وقت الہامی شاعر اقبال کے یہ شعر زبان پر از خود جاری ہو رہے تھے ؎

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحراء و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

یہی وہ ''لذت آشنائی'' ہے جس کے سامنے تیر وتفنگ کی طاقت، افواج کی کثرت، وسائل جنگ کی فراوانی اور دنیا کی ساری مادی حقیقتیں ماند پڑ جاتی ہیں، اس ''لذت آشنائی'' کی دولت سے سرشار لوگ کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور جب وہ اس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں تو پھر فرشتے بھی ان کی نصرت کو اترتے ہیں، قرآن مجید نے اسی ''لذت آشنائی'' کے حصول پر زور دیا ہے، یہ لذت آشنائی قرآن کی زبان میں راہی ''سکینت'' ہے جو بطور مدد وانعام اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں انسان بے خوف وخطر بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ ہر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، ایمان ویقین کی اس طاقت کے بعد وسائل کی تیاری کی تلقین کی ہے، جد وجہد پر ابھارا ہے اور پھر نصرت کا وعدہ کیا ہے، قانونِ الٰہی میں بدون جد وجہد اور بغیر

وسائل کا استعمال کیے نصرت خداوندی کی کوئی گنجائش نہیں، ازبدرتا طالبان امریکہ جنگ اسی حقیقت کے مظاہر نظر آتے ہیں، ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ نے اپنے منصوبہ کے مطابق ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کیا، پھر بڑی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولا اور اس حملہ کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا، القاعدہ نامی تنظیم پر اس کی ذمہ داری ڈالی، طالبان پر انھیں پناہ دینے کی ذمہ داری عائد کی اور ۷ر اکتوبر ۲۰۰۱ء کی رات ۹ بجے کابل پر حملہ کردیا، درجنوں طاغوتی طاقتیں تھیں جن کا الائنس بنا تھا، اس الائنس کی سربراہی امریکہ کررہا تھا اور امریکہ کو اس مرتبہ مملکت خداداد سے افغانی مسلمانوں کو قتل کرنے کی راہیں دی جارہی تھیں، زمین وفضائی حدود ان کے لیے کھول دی گئی تھیں، بلکہ طالبانی رہنماؤں کو گرفتار کرکے امریکہ کے سپرد کرنے کا کام بھی بہادر پاکستانیوں نے کیا تھا، یہ وہی مملکت تھی جس نے افغانستان میں سوویت یونین کے پرخچے اڑانے اور مدفن بنانے میں بڑا قائدانہ کردار ادا کیا تھا، بس فرق یہ تھا کہ اُس وقت حکمراں وہ تھا جس کو شہید کرانے میں امریکہ نے اپنی عافیت سمجھی تھی اور اِس وقت حکمراں وہ تھا جسے پالنے میں امریکہ نے بڑی تگ ودو کی تھی، جو لبرلزم کے جبروتی ماڈل کمال ترک کو اپنا آئیڈیل کہتا تھا، ایک طرف یہ سب تھا تو دوسری طرف افغانستان کے اندر ایران کے حمایت یافتہ منافقین تھے جو مارِ آستین بنے ہوئے تھے، ان ساری آزمائشوں کے باوجود ''مُلّاؤں'' نے کسی کی ایک نہ سنی، کسی نے دیوانہ کہا، کسی نے اجڈ کہا، کسی نے گنوار کہا، کسی نے کہا کہ ملا کی ضد اور ہٹ دھرمی نے پوری دنیا کے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کردیا ہے، زندگی اجیرن کردی ہے، راہ چلنا دشوار کردیا ہے، مگر مُلّاؤں کے سامنے حقیقت واضح تھی چنانچہ وہ وقت کی سپر پاور بلکہ ''احزاب'' سے ٹکرا گئے، وہ جانتے تھے کہ امت ''وہن'' کی شکار ہے، یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار ہے اور اس پر موت کا خوف طاری ہے، اس لیے وہ اس طرح کے الزامات دھر رہی ہے، ان کے سامنے وہ بات مجسم حقیقت کے طور پر موجود تھی جو حضرت ابوبکر نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمائی تھی ''لا یدع قوم الجهاد فی سبیل الله الا خذلهم الله بالذل'' (البدایۃ والنہایۃ ۵/۳ خلافۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ) (ترجمہ: جو قوم بھی جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کرے گی اللہ اس کو ذلیل ورسوا کردے گا) انھوں نے مسلمانوں کی ذلت و نکبت اور پستی ورسوائی کے اس نکتۂ اصلی کو سمجھ کر اس پر عمل کو اپنا لائحہ عمل بنالیا اور حضورؐ کے اس قول کا مصداق بن گئے کہ ''لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى يأتى امر الله وهم كذلك''۔ (أخرجه مسلم حديث ۱۹۲۰) (ترجمہ: میری امت میں ایک گروہ یا جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے گی جو حق پر کاربند ہوگی اس کا برا چاہنے والے خود ذلیل و رسوا ہوں گے اس جماعت کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طاقت کے توازن کا فلسفہ ایک بار پھر جھوٹ ثابت ہوا، تعداد کی قلت وکثرت کے جس فلسفہ کی قرآن نے یہ کہہ کر ہوا نکال دی تھی کہ ''كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيره'' (البقرہ آیت ۲۴۹) (ترجمہ: بارہا ایسا ہوا ہے کہ قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے) ان ملاؤں کی جہد مسلسل نے اسے پھر حق ثابت کر دکھایا اور دنیا نے کھلی آنکھوں سے ''احزاب'' کے فرار کا وہ منظر دیکھا جس کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''سيهزم الجمع و يولون الدبر''۔ (ترجمہ: عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے)۔

امریکہ نے افغانستان پر جو چڑھائی کی تھی اس کا اصل سبب دراصل یہ تھا کہ سوویت یونین کے حصے بخرے کرنے میں امریکہ کا کردار نمایاں تھا، کیونکہ روس کے بعد اب وہ عالمی طاقت بن کر ابھرنے والا تھا، کمیونزم وسوشلزم کا جنازہ اٹھنے کے بعد

جب کیپٹلزم کا علمبردار امریکہ سپر پاور بنا تو اس نے دیکھا کہ اس کے نظریہ کو اب مستقبل میں کوئی خطرہ اگر ہے تو اسلام سے ہے، چنانچہ اس نے اسلام کو اپنا دشمن متعین کیا، اس کے لیے یہ بات بھی سوہانِ روح تھی کہ اس نے جن افغانی مجاہدین کی روس کے خلاف مدد کی تھی وہی آگے چل کر اس اسلامی نظام کے حامل بن گئے جس نظام کو امریکہ خطرہ سمجھ رہا تھا، کیونکہ اس کو اسلامی مظاہر سے خطرہ نہیں وہ تو اس کے دوست مسلم ممالک میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں، افغانستان میں یہ اسلامی نظام قائم ہونے کے بعد اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا امریکہ کی پہلی چاہت اور پہلا فریضہ تھا، جس میں بظاہر وہ کامیاب ہوا مگر بالآخر یہ بھی ثابت کیا کہ یہ اسلامی نظام ہی ایک نہ ایک دن غالب آ کر رہے گا۔ "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"۔ (توبہ ۳۳) (ترجمہ: اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب فرما دے، چاہے مشرکوں کو یہ کیسا ہی برا لگے)۔

اس درمیان لوگوں نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ امریکہ ہی نے طالبان کو کھڑا کیا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روس کے خلاف جب افغانیوں کی مسلح جدوجہد شروع ہوئی تو روس کو شکست دینے کے لیے امریکہ نے افغانیوں کی ہتھیاروں کے ذریعہ مدد کی، اس وقت سرفروش مجاہدین تو تھے مگر طالبان کے نام سے جماعت وجود میں نہ آئی تھی، تین سال کے بعد امریکہ نے ایک مصالحتی حکومت بالفاظ دیگر اپنی کٹ پتلی حکومت کے قیام کی پیشکش کی، بصورت دیگر امداد روکنے کی دھمکی دی، افغانیوں نے جواب دیا کہ ہمیں مدد کی ضرورت نہیں ہم دشمن کا اسلحہ چھین کر اس پر حملہ کرنا سیکھ چکے ہیں، اس دور کی امریکی امداد کو بنیاد بنا کر یہ کہنا کہ امریکہ نے ہی طالبان کو کھڑا کیا قطعاً درست نہیں، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ امریکہ نے بہت سے گروپ افغانستان کے اندر صرف اس لیے تشکیل دیے کہ طالبان کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے شکست دے سکے، مگر نہ وہ میدانِ جنگ میں شکست دینے میں کامیاب ہو سکا اور نہ اس کا پروپیگنڈہ ہی کامیاب ہوا، چنانچہ جسے پروپیگنڈہ مہم کے ذریعہ بدنام کیا اس سے ہی پوری دنیا کے سامنے معاہدۂ امن کیا۔

یہ مرحلہ جو کم وبیش ۱۸ سال پر محیط ہے بڑا سخت جان و جاں گسل تھا، اس مدت میں دنیا نے بڑے تغیرات دیکھے، لمحہ بہ لمحہ حالات بدلتے رہے مگر یہ "پُر اسرار بندے" اپنے مشن پر ڈٹے رہے، مبصرین پہلے تو ان کی ضد و ہٹ دھرمی کا راگ الاپتے رہے، پھر ان کو خونخوار دہشت گرد قرار دینے کا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور وہ پروپیگنڈہ کچھ اس حد تک کیا گیا کہ دنیا بھر میں ٹوپی، عمامہ اور ڈاڑھی گویا دہشت گردی کی علامت بن گئی، ہمارے وطن عزیز میں "طالبانی سوچ" اور "طالبانی صورت" کہہ کر طعنے دیے جانے لگے، اور اہل دین کو پریشان کیا جانے لگا، بہت سے لوگ تو صفائی بھی دینے لگے، اسی سلسلے میں ایک قائد کا ایک مفصل انٹرویو بڑا دلچسپ تھا، ۱۸ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی، لوگوں نے ان بے چاروں سے رشتہ بھی توڑ لیا، ان کا تذکرہ کرنا بھی چھوڑ دیا، جب ذکر آیا بھی تو ان کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دینے کے لیے، غلط قرار دینے کے لیے مگر پھر بالآخر وہ دن بھی آیا جب دنیا کے سپر پاور نے گھٹنے ٹیکے، امن کے معاہدے کی بھیک مانگی، زندہ و سلامت نکل جانے کی دہائی دی، طالبان اہل ایمان تھے "وان جنحوا للسلم فاجنح لھم" (الانفال آیت ۶۱) (ترجمہ: اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ) پر عمل کیا اور امن معاہدہ کے لیے تیار ہو گئے، دنیا نے دیکھا کہ کل تک امریکہ جن کو دہشت گرد کہہ رہا تھا آج ان کو ایک باعزت اور متوازی طاقت تسلیم کرتے ہوئے معاہدہ کر رہا ہے، دنیا مبہوت تھی، طاغوتی میڈیا محوِ حیرت تھا، بہت سے اسلام دشمنوں پر سکتہ طاری تھا، وہ اس معاہدہ کو "صدی کا سب سے

خطرناک معاہدہ'' قرار دے رہے تھے، وہ سوچ رہے تھے کہ کل تک جنھیں دہشت گردی کی علامت بنا دیا گیا تھا آج انھیں کس طرح دنیا برابری کی سطح پر تسلیم کر رہی ہے، طالبانی رہنماؤں کی بے نیازی قابل دید تھی، وہ کمالِ بے نیازی کے ساتھ اپنے محاذ اور اپنے شرائط پر ڈٹے ہوئے تھے اور امریکہ پورا زور اس پر صرف کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح افغانستان سے نکلنے میں کامیاب ہوجائے، دنیا نے دیکھا کہ وہ ملا عبدالغنی برادر جس کو امریکہ نے ملا عمر کے بعد دنیا کا سب سے خونخوار دہشت گرد قرار دیا تھا، اسی سے صدر امریکہ نے ۳۵ رمنٹ ٹیلی فون پر گفتگو کی اور پھر پریس کانفرنس میں کہا کہ بہت اچھی گفتگو رہی، یہی نہیں بلکہ جب ٹرمپ سے پوچھا گیا کہ کیا طالبان اقتدار میں آجائیں گے تو ٹرمپ کا جواب تھا کہ اس میں کیا شک انھیں آنا ہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ طالبان امریکہ معاہدہ نے مسلمانوں پر لگے دہشت گردی کے داغ کو یکسر دھو دیا ہے، اب امریکہ کے غلاموں کو ''مُلّاؤں'' کے لیے یہ اصطلاح استعمال کرنے میں محتاط ہونا چاہیے ورنہ ان کے آقا ناراض بھی ہوسکتے ہیں۔

امریکہ نے بہت پہلے اس کا اندازہ کرلیا تھا کہ وہ طالبان کو میدان جنگ میں شکست نہیں دے سکتا، چنانچہ آج بھی ۷۰/ فیصد علاقہ پر طالبان کا کنٹرول ہے اور عوام کی اکثریت طالبان کے ساتھ ہے، بلکہ بہت سے مبصرین کی بات مانیں تو اشرف غنی اور عبداللہ عبداللہ دو دو کلومیٹر کے صدر ہیں، عوام کے ساتھ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عرصہ کے بعد طالبان کے ذریعہ قائم کیے گئے اسلام کے نظام عدل میں انھوں نے امن وچین کی سانس لی تھی، اس حقیقت کا اظہار وقتاً فوقتاً امریکی فوجی اور دیگر ذمہ داران کرتے رہے ہیں، بالآخر ٹرمپ نے تو افغان جنگ کو ''غلطی'' ہی قرار دے ڈالا اور امریکہ کے وہاں سے نکلنے کے محفوظ راستے ڈھونڈنے میں لگ گیا، اور پھر وہ طالبان کو مذاکرات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن ابتدا میں اس نے ''امارت اسلامی افغانستان'' کے بینر سے معاہدہ کرنے پر اعتراض کیا، طالبان نے منہ موڑا اور اپنی کارروائی میں مشغول ہوگئے، امریکہ نے اس نکتہ پر رضامند ہوکر پھر پیشکش کی مگر اس پر اٹک گیا کہ طالبان اسلامی نظام کے بجائے جمہوریت کو حرز جاں بنائیں، طالبان نے اپنی کارروائیاں اور تیز کردیں کیونکہ اسلامی نظام سے دستبرداری کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، پہلی بار یہ موقع آیا تھا عرصہ کے بعد کہ طاغوتی طاقتیں براہِ راست اسلامی نظام کے قائم کرنے والوں سے برابری کی سطح پر معاہدہ کر رہی تھیں، طالبان اچھی طرح جانتے تھے، حقیقی طالبان شریعت الٰہیہ کا بہترین فہم رکھتے تھے اس لیے ان کو معلوم تھا جمہوریت اور اس کے پرفریب عنوانات پر حقیقی عمل تو اسلامی نظام میں ہی ممکن ہے، ورنہ پرفریب عنوان کے پسِ پردہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' جمہوریت کی اصل ہے، امریکہ کی کمر افغانستان میں خرچ کرکر کے اس قدر ٹوٹ گئی تھی کہ وہ بالآخر اس کو بھی مان کر میز پر آگیا اور خواہش کی کہ مذاکرات میں اس کی کٹ پتلی افغانی حکومت کو بھی شامل کرے جو کابل اور اس کے اطراف پر محیط ہے، اس کے پیچھے دراصل امریکہ کی یہ خواہش تھی کہ طالبان حکومت میں اشتراک Power Sharing پر راضی ہوجائیں، مگر طالبان نے صاف منع کردیا کہ ہم غلام وکٹ پتلی حکومت کو معاہدہ میں شریک نہیں کرسکتے، اور پاور شیئرنگ کا کوئی مطلب ہی نہیں ہمارے یہاں، ہم نے جنگ ہی اس لیے کی تاکہ افغانستان میں امن و استحکام اور اسلامی حکومت قائم ہوسکے اور وہ غیر ملکی مداخلت سے پوری طرح آزاد ہوسکے، جبکہ کابل انتظامیہ کو شریک کرنے کا مطلب ہے کہ امریکہ آئندہ بھی افغانستان میں موجود رہے گا جس پر ہم کبھی راضی نہیں ہوسکتے، ہم بات ہی اس وقت کریں گے جب غیر ملکی طاقتیں پوری طرح سے افغانستان سے نکلنے پر آمادہ ہوں، بالآخر معاہدہ طے ہوا، قیدیوں کے تبادلے پر مفاہمت ہوئی، ۱۴/ ماہ کے اندر امریکیوں کے مکمل انخلا

کی شرط طے پائی، طالبان نے جنگ بندی پر معاہدہ کیا، یہ بھی طے پایا کہ امریکہ نہ صرف طالبان پر سے تمام پابندیاں ہٹائے گا بلکہ وہ اقوام متحدہ کے ذریعہ لگائی گئی پابندیاں ہٹوانے کی بھی پوری کوشش کرے گا، یہ بھی طے پایا کہ طالبان و کابل انتظامیہ جلد ہی آپسی مذاکرات سے مسائل کے حل تک پہنچیں گے۔

معاہدہ پر عمل درآمد شروع ہو چکا، جلد ہی طالبان رہنماؤں سے امریکی صدر کی براہِ راست ملاقات کی خبریں گردش میں ہیں، جس وقت معاہدہ پر دستخط ہو رہے تھے دنیا بھر کے تقریباً ۵۰/ وزرائے خارجہ ہال میں موجود تھے، البتہ بہت سے شریک نہیں بھی ہوئے کیونکہ ان کے سینوں پر تو سانپ لوٹ رہا تھا، وہ ممالک بہت پریشان تھے جنھوں نے امریکہ کے سہارے افغانستان میں حصہ داری کے خواب دیکھ رکھے تھے اور اس کے لیے ہزاروں کروڑ کی سرمایہ داری کر رکھی تھی، ان کے علاوہ اصل مشکل تو محمد بن سلمان اور محمد بن زاید کی تھی جو اپنی سوچ اور اپنی روش اور اسلامی نظام سے تنفر کے سبب اس معاہدہ میں شریک بھی نہ ہو سکے، طالبان اور دوحہ کی کوششوں کی تعریف بھی نہ کر سکے مگر معاہدہ کی تائید کرنا تو ان کی مجبوری تھی، اس لیے کہ مدمقابل فریق ان کا آقا تھا، یہی وجہ ہے کہ بیشتر عرب ممالک کے سرکاری میڈیا میں اس معاہدہ کی تعریف تو کی گئی مگر واضح طور پر آزاد لوگوں کی طرح نہ طالبان کی طویل جدوجہد کو سراہا گیا، نہ یہ کہا جا سکا کہ بالآخر امریکہ کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور نہ ہی دوحہ کی کوششوں کی تعریف کی گئی۔

اس معاہدہ سے ایک نئی ابتدا اور ایک نئی تبدیلی کی امید ہے، اس کے نتیجہ میں دنیا کے سامنے مسلمانوں اور بالخصوص دینداروں کی ایک نئی تصویر بننے کی امید ہے بشرطیکہ وہ خود بنانے میں کامیاب ہو جائیں، اس معاہدے کے نتیجہ میں جہاں یہ معلوم ہوا کہ طاقت کا توازن اور وسائل کی قلت کے کوئی معنی نہیں، اصل شے تو وہ جذبہ ہے جس کی قرآن آبیاری کرتا ہے، وہیں یہ حقیقت بھی ایک بار پھر آشکارا ہوگئی کہ ظالم اور ناحق لڑنے والے میدان میں ڈٹ نہیں سکتے، بالآخر انھیں میدان چھوڑ کر جانا ہی پڑتا ہے، کیونکہ انسانی نظریات پر مشتمل جنگ کا وہی حال ہوتا ہے جو انسانی نظریات کا، ان کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے، سوڈیڑھ سو سال بس، رہے نام اللہ کا، اس کے نام لیوا اور اسلامی نظریہ رکھنے والوں کے لیے بقاء و دوام و استحکام کی بشارت ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے، برطانوی، فرانسیسی، روسی اور اب امریکی استعمار کی تاریخ اس کی تازہ مثال ہے، مگر اس کا خطرہ برقرار رہتا ہے کہ استعمار اپنی ایجنسی چھوڑ کر جائے، کیونکہ تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ استعماری طاقتیں جہاں سے جاتی ہیں وہاں اپنی ایجنسیاں اور کالونیاں چھوڑ کر جاتی ہیں، افغانستان کی کابل انتظامیہ اس کی مثال ہے، البتہ طالبان کی امارت اسلامی اور اسلامی نظام پر ان کی استقامت سے اس خطرہ کا امکان کم ہو جاتا ہے بلکہ انھوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے اس کے امکانات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں، البتہ خانہ جنگی کا امکان کل بھی تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا اگر اس سے یہ لوگ ملک کو بچانے میں کامیاب ہو گئے تو پوری امید ہے کہ جلد ہی افغانستان میں امن و ترقی کی راہیں ہموار ہوں گی اور بہت تیزی سے تبدیلی آئے گی۔

معاہدہ کی پوری کارروائی کو دیکھتے ہوئے یہ خوش آئند بات بھی سامنے آئی کہ طالبان نے بڑی حد تک اپنے آپ کو اپ ڈیٹ کیا ہے اور خود کو جدید وسائل سے ہم آہنگ کیا ہے، برخلاف اس کے کہ جب وہ آئے تھے تو جدید وسائل سے بُعد بلکہ تنفر کے سبب سرد جنگ کے محاذ پر پہلے ہی شکست کھا گئے تھے، اس معاہدہ سے ان کی مضبوط سفارت کاری کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، البتہ سفارت کاری تب ہی مضبوط ہوتی ہے جب آپ زمین پر مضبوط ہوں، اور زمینی گرفت و طاقت میں افغانستان میں ان کا کوئی ثانی نہیں، جبر و استبداد کی عادی آس پاس کی ظالم طاقتیں اس معاہدہ سے یقیناً پریشان ہیں مگر انھوں نے جتنی بڑی سرمایہ کاری کر رکھی ہے اس کے نتیجہ میں ان کو قطعی

طور پر اپنے آپ کو دھرمِ سنکٹ میں نہ ڈالنے کی ترکیبیں سوچنی ہی پڑیں گی، اپنے رویوں میں تبدیلی لانا ہی ہوگا اور جنھیں ''دہشت گرد'' قرار دیا تھا انھیں ''عادل و امن پسند'' تسلیم کر کے تعلقات استوار کرنا ہی ہوگا۔

بعض لوگوں نے اپنے جذبات میں اس معاہدہ کو ''فتح مبین'' قرار دیا، ہم یقیناً اس سے پورے طور پر اتفاق نہیں رکھتے، مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر امکانات صحیح ثابت ہوئے تو یہ معاہدہ ان شاء اللہ فتح کی بشارت بلکہ فتوحات کی تمہید ثابت ہوگا، ویسے نور بصیرت سے دیکھنا اور بات ہے، عقل وخرد کے پیمانوں پر پرکھنا اور بات ہے، ''فتح مبین'' کہنا تو قبل از وقت ہوسکتا ہے مگر ''انا فتحنالك فتحا مبينا" (الفتح آیت ۱) (ترجمہ: ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کردی) کا جس پس منظر میں نزول ہوا اس کو سامنے رکھیے تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر کیا تھا، صلح حدیبیہ وہ معاہدۂ صلح تھا جس میں مسلمانوں نے بہت دب کر صلح کی تھی حتی کہ مسلمانوں کے سامنے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ابو جندلؓ اور ابو بصیرؓ کو مشرکین کے حوالے کرنا پڑا تھا، حضرت عمرؓ نے اس آیت کو سن کر دریافت کیا تھا اے اللہ کے رسول کیا یہ فتح ہے، حضور نے فرمایا: ہاں (ابن جریر)، ایک اور صحابی نے دریافت کیا تو جواب میں حضور کے الفاظ یہ تھے ''إي والذي نفس محمد بيده إنه لفتح" ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے یقیناً یہ فتح ہے''، واقعہ یہی تھا کہ یہ معاہدہ فتح کی تمہید تھا، دو سال کے عرصہ میں اس سورہ کے تمام وعدے ووعیدیں پوری ہوئیں، مکہ فتح ہوا، خیبر فتح ہوا، جنین میں کامیابی ملی، جزیرۃ العرب اسلام کی آغوش میں آیا، جبکہ اس وقت کی صورت حال یہ تھی جب یہ بشارت دی جارہی تھی کہ مدینہ پہنچ کر ایک صاحب اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے یہ کیسی فتح ہے؟ ہم کو بیت اللہ جانے سے روک دیا گیا حتی کہ ہماری قربانی کے اونٹ بھی آگے مقام نحر تک نہ جاسکے، خود حضور کو مقام حدیبیہ پر رکنا پڑا اور معاہدہ کے سبب ہمارے دو مظلوم بھائیوں کو ظالموں کے سپرد کیا گیا، یہ گفتگو نبیؐ تک پہنچی تو فرمایا بڑی غلط بات کہی گئی۔ آگے نبیؐ کا جواب پڑھنے سے قبل ۱۸ر سالہ طویل جنگ، امریکی غرور، امریکہ کے وسائل جنگ، دو دن میں افغانستان کو راکھ میں ملانے کی اس کی دھمکیاں اور اس کے ساتھ پوری دنیا کی ہمدردیاں ذہن میں رکھیے اور یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ بالآخر اسی نے جنگ بندی کی دہائی دی، اسی نے معاہدہ امن کی پیش کش کی، وہی خود میدان جنگ سے بھاگ کر مذاکرات پر آمادہ ہوا، یہ سب ذہن میں رکھ کر حضورؐ کا یہ جواب پڑھیے، حضورؐ نے فرمایا: بڑی غلط بات کہی گئی، حقیقت میں تو یہ بڑی فتح ہے، تم مشرکین کے عین گھر پر پہنچ گئے، انھوں نے تم کو آئندہ سال عمرہ ادا کرنے کی درخواست کر کے واپسی پر راضی کیا، انھوں نے خود تم سے جنگ بندی کی درخواست کی، صلح کرنے کی خواہش ظاہر کی، حالانکہ ان کے دلوں میں جس قدر تمہارے متعلق بغض ہے وہ معلوم ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر غلبہ دیا، کیا وہ دن بھول گئے، جب احد میں تم بھاگے جارہے تھے اور میں تم کو پیچھے سے پکار رہا تھا؟ کیا وہ دن بھول گئے، جب جنگ احزاب میں دشمن تم پر چڑھ آئے تھے اور کلیجے منہ کو آرہے تھے؟'' (بیہقی) اس پس منظر اور حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیجیے، عمل پر کمر کسیے، خدا پر اعتماد کیجیے اور اسی سے دعا کیجیے اس کے لیے کیا مشکل کہ وہ ایک معاہدہ کو فتح کی تمہید بنادے ''وما ذلك على الله بعزيز" پھر ہم تو جیتے ہی ہیں اس دن کے انتظار میں "ويومئذ يفرح المؤمنون بنصر الله ينصر من يشاء وهو العزيز الرحيم." (روم آیت ٤—٥) (ترجمہ: اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے)

☆☆☆

❑ فکر و تدبر

نہی عن المنکر سے پہلوتہی بھی زوالِ امت کا ایک بڑا سبب

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اس دین میں بڑی اہمیت ہے، دونوں یکساں طور پر فرض ہیں، دونوں میں تفریق کی گنجائش نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ اسی کے لیے اس امت کو پیدا کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے "کنتم خیر امة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر" مگر واقعہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کا فریضہ تو کسی نہ کسی حال میں نبھایا جاتا ہے، خیر کی طرف بلانے کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے، اور اب بھی جاری ہے، لیکن نہی عن المنکر کا دائرہ بڑا محدود ہے، منکر کی نکیر، غلط اقدام پر روک ٹوک، بے جا عمل پر تنقید ایک تو خود ہی بہت مشکل کام ہے، دوسرے اس کو خواہ کوئی کتنی ہی اچھی طرح انجام دے، لاکھ منطقی و استدلالی اسلوب میں خبیث کو طیب سے الگ کرنے کا کام کرے مگر ہمارے معاشرے میں اس کو سرے سے پسند ہی نہیں کیا جاتا، ذرا جو آپ نے غلط قول و عمل، مہلک پالیسیوں اور خطرناک اقدامات پر زبان کھولی تو لوگ فوراً پیچھے پڑ جاتے ہیں اور کچھ یوں نصیحت کرتے ہیں خود خیر کے کام کیجئے، لوگوں کو خیر کی طرف بلائیے، کسی پر تنقید سے کیا حاصل، کسی کی ٹانگ کھینچنے سے کیا فائدہ، بڑے بڑے غلط ترین ملی فیصلوں سے ملت تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے مگر اس پر نکیر کرنا بہر حال بہت بڑا جرم ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کا چلن عام ہے، لوگ اس لیے بھی غلط کو غلط نہیں کہتے کہ اکثر لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، مصلحتیں منکر کی نکیر کرنے سے قربان ہو جاتی ہیں، مراعاتیں ختم ہو جاتی ہیں، لوگ جھوٹی سچی تعریفیں سننے اور کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، کانوں کو مدح سرائی اور القاب نوازی کے علاوہ کوئی حقیقت پسندانہ لفظ تک سننا گوارہ نہیں، بات تو یہاں تک آ پہنچی ہے کہ لوگ اپنے ممدوح میں سوائے سامانِ توصیف کے کچھ پاتے ہی نہیں ؎

دیکھوں تجھے تو دامن توصیف کہہ اٹھے
ایک حرف بھی ملا نہیں تنقید کے لیے

یا یوں کہیے کہ ؎

جملے تنقید کے سب حذف ہوگئے

صورت حال یہ ہے کہ ایک بچے کو بھی منہ پر ٹوک دیجئے تو پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں چہ جائیکہ کوئی بڑا ہو، صاحب حیثیت ہو، حالانکہ بعض لوگوں نے حقیقی معنی میں نصیحت و خیر خواہی اسی کو قرار دیا ہے کہ وہ جس کے منہ پر کی جائے اسے بری لگے، ''میمون بن مہران نے اپنے ایک ساتھی سے کہا میرے منہ پر وہ بات کہو جس کو میں ناپسند کرتا ہوں، اس لیے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کے لیے اس وقت تک ناصح و خیر خواہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے منہ پر وہ

بات نہ کہے جسے وہ ناپسند کرتا ہو‘‘۔(نضرۃ النعیم۳/۵۳۸)

جی میں آتا ہے کہ ان چیں بہ جبیں ہونے والوں اور ناراض ہوجانے والوں سے شاعر کی زبان میں یوں کہا جائے۔

طیش میں آنے لگے تم تو میری تنقید پر
اس قدر حساس ہو تو آئینہ دیکھا کرو

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور تقریبا ہر جگہ ساتھ ساتھ دونوں کو ذکر کیا گیا ہے سوائے ان مقامات کے جہاں خاص سیاق میں کسی ایک پہلو کا تذکرہ مقصود ہو، چنانچہ خیر کی دعوت دیتے ہوئے ایک طرف تو قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے ’’ولتكن منكم امة يدعون إلى الخير، يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و أولٰئك هم المفلحون‘‘ (آل عمران۱۰۴)(ترجمہ:تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے) دوسری طرف قرآن مجید نہی عن المنکر کو ترک کرنے والوں، آنکھوں پر پٹی باندھنے والوں، قانون الٰہی تبدیل کر لینے والوں اور برائی کی روک تھام سے جان چرانے اور راہ فرار اختیار کرنے والوں اور اس کے سبب زوال پذیر ہونے والوں کا تذکرہ کچھ اس اسلوب میں کرتا ہے ’’لعن الذين كفروا من بني اسرائيل على لسان داؤد و عيسى بن مريم ذٰلك بما عصوا وكانوا يعتدون، كانوا لايتناهون عن منكر فعلوه لبئس ماكانوا يفعلون‘‘ (مائدہ۷۸-۷۹) (ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتی کرنے لگے تھے انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا برا طرز عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا) غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ بنی اسرائیل پر خدا نے داؤد و عیسی کی زبان سے لعنتیں بھیجیں کیونکہ انھوں نے نافرمانیاں اور زیادتیاں کیں، اس کا سبب یہ ہوا کہ وہ جن برائیوں میں مبتلا ہوئے اور جو بدترین کرتوت انجام دیے، آپس میں اس کی روک تھام کے عمل اور منکرات پر نکیر کے سلسلہ کو بند کر دیا، نتیجہ جو ہوا وہ معلوم ہے کہ ان کو معزول کر دیا گیا، ان کی افضلیت ختم کر دی گئی ان کی عالمی حیثیت کے باوجود ان کو دنیا کی ذلیل و رسواترین قوم بنا دیا گیا، یہ لعنتیں جو کی گئیں وہ انجیل میں موجود ہیں، مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں نقل کی ہیں، ان کے الفاظ انتہائی سخت ہیں، ان کی کرتوتوں کا ان میں تذکرہ ہے، مگر پڑھیے تو لگتا ہے کہ وہی سب کچھ اس امت میں ہو رہا ہے، برائی پر روک ٹوک کو خود برا عمل سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ اس تفریق کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، بسا اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس امت میں بھی دو قانون جاری ہیں، بنی اسرائیل کی طرح اشرافیہ کے لیے الگ قانون ہے اور عام لوگوں کے لیے الگ، خدانخواستہ اگر کسی غلط اقدام کی نکیر کر دی جائے تو پھر دو انتہائیں وجود میں آتی ہیں، ایک طبقہ تو وہ ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ وہ بڑے ہیں، ان کا علم و تجربہ زیادہ ہے، انھوں نے جو کہا ہوگا اس کی مصلحت وہی جانتے ہوں گے کسی کو ان پر نقد کا کیا حق حاصل، کون ہے جو ان کے مقام و مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے؟ جب کہ دوسری طرف ایک طبقہ حسب و نسب تک کھود ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہے اور پروپیگنڈے اور فحش کلامی تک پر اتر آتا ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ بغیر کسی تفریق کے بس برائی کو برا کہا جاتا، مگر یہ فریضہ ادا کرنا تو تقریباً سبھی نے چھوڑ دیا، الا یہ کہ کچھ مضامین میں برائیاں شمار کرا دی جائیں یا علی العموم منکرات کا گفتگو میں تذکرہ کر دیا جائے،

سوچنے کا مقام ہے کہ بنی اسرائیل کے ملعون ہوجانے کا ایک سبب قرآن مجید نے یہ قرار دیا ہے کہ انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو برائی پر روکنا اور ٹوکنا بند کردیا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے یوں فرمایا:

إن أول مادخل النقص على بنى اسرائيل كان الرجل يلقى الرجل فيقول: يا هذا اتق الله و دع ما تصنع فإنه لا يحل لك، ثم يلقاه من غد فلا يمنعه ذٰلك أن يكون أكيله و شريبه و قعيده، فلما فعلوا ذٰلك ضرب الله قلوب بعضهم ببعض، ثم قال "لعن الذين كفروا من بنى اسرائيل على لسان داؤد و عيسىٰ بن مريم (المائدة ۷۸–۸۱) إلى قوله فاسقون" ثم قال: "كلا والله لتأمرن بالمعروف و لتنهون عن المنكر، ولتأخذن على يدى الظالم و لتأطرنّه على الحق أطرا ولتقصرنّه على الحق قصرا۔ (مسند احمد ۱/ ۳۹۱)

(ترجمہ: بنی اسرائیل کے اندر پہلی جو بیماری داخل ہوئی وہ یہ کہ باہم جب وہ ملتے تو ایک دوسرے کو تلقین کرتے کہ اللہ سے ڈرو ہر وہ کام جو تمہارے لیے جائز نہیں (عصیان) اس سے باز آجاؤ، (لیکن پھر یہ تبدیلی آ گئی) کہ آئندہ انھوں نے ملاقات کے وقت ایک دوسرے کے ندیم وہم نشیں اور ہم پیالہ ہونے کی وجہ سے منکرات پر روک ٹوک کرنا چھوڑ دیا، جب یہ مرض ان کے اندر عام ہوگیا تو اللہ نے ان ہی کی زبانی ان پر لعنت بھیجی، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی''، پھر آپ نے ارشاد فرمایا تمہاری بعثت کا مقصد ہی بھلائی کا حکم اور برائی سے روکنا ہے تمہیں بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ تم ضرور ظالم کا ہاتھ ظلم سے روکو گے اور خود بھی ظلم سے بچو گے، حق پر جمے رہو گے)

غور کیجئے آج ہم کہاں کھڑے ہیں ظالم کے ساتھ یا مظلوم کے ساتھ، کیا ہمارے اندر ظالم کو ظالم اور ظلم کو ظلم کہنے کی جرأت ہے، ظلم حکومت بھی کرتی ہے، عوام سے بھی ظلم کا ارتکاب ہوتا ہے، ظلم امیر بھی کرسکتا ہے اور غریب بھی، ظلم کے مرتکب اہل دین بھی ہوسکتے ہیں اور دین بیزار بھی، ظلم کی تعریف وضع الشيئ فى غير محله کو ملحوظ رکھیے تو جگہ جگہ ظلم نظر آئے گا، ظلم گھروں میں، معاشرہ میں، حکومت میں، اداروں میں اور تنظیموں میں ہر جگہ ہوسکتا ہے، سوال تو یہ ہے کہ کیا اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے ظلم کو ہم ظلم کہتے ہیں اور کیا ہمارے اندر حق کے ساتھ کھڑے ہونے اور حق پر جمے رہنے کا جذبہ ہے، ممکن ہے کہ لوگ تاویل کریں اور کہیں کہ نہیں صاحب یہ عمل تو ہورہا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح روک تھام کا عمل کیا جانا چاہیے نہیں ہورہا ہے اور اکثر وبیشتر نہیں کیا جاتا ہے، ذرا امام نووی اپنے عہد میں جو کچھ لکھتے ہیں اس کو پڑھیے اور اس کی روشنی میں اپنے عہد کا جائزہ لیجئے، یاد رہے کہ امام نووی کا زمانہ ساتویں صدی ہجری ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اعلم أن الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر قد ضيع اكثره من ازمان متطاولة ولم يبق منه فى هذه الأزمان الارسوم قليلة جدا، وهو باب عظيم به قوام الأمر وملاكه، و إذا كثر الخبث عم العقاب الصالح والطالح، وإذا لم ياخذوا على يد الظالم أوشك أن يعمهم الله تعالىٰ بعقابه" فليحذر الذين يخالفون عن امره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم۔" (مسلم شرح النووى)

(ترجمہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس زمانے (ساتویں صدی ہجری) میں تقریباً مفقود ہو چکا ہے جس قوت

کے ساتھ یہ کام ہونا چاہیے نہیں کیا جارہا ہے، جبکہ یہ تمام قسم کے امور و معاملات کا ایک اہم نسخہ اور بڑا ذریعہ ہے، جب نافرمانیاں و خباثتیں کثرت سے جنم لینے لگتی ہیں تو پھر عقاب الٰہی خواص و عام کسی کو نہیں چھوڑتا، اگر ظالم کا ہاتھ نہ روکا جائے اس کی گرفت نہ کی جائے تو قریب ہے اللہ تمام لوگوں کو عذاب میں مبتلا کردے، (العیاذ باللہ) ''ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو اس کے حکم کی خلاف ورزی کررہے ہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنہ و آزمائش ان کو آ پکڑے، یا دردناک عذاب ان کو پہنچے'')۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ظلم کو ظلم اور ظالم کو ظالم کہنے میں بھی مصلحتیں آڑے آتی ہیں، صریح ناانصافیوں کو بھی ناانصافی کہنے سے لوگ ناراض ہوجاتے ہیں، کھلے عام اسلامی اقدار کی پامالی پر نکیر کرنا بھی جرم شمار ہوتا ہے، عجیب حال ہو چکا ہے کہ آدمی ملت کی تباہی کا سامان کھلے عام کرتا ہے، اس کے اثرات متعدی ہوتے ہیں مگر جب اس پر کھلے عام نقد کیا جائے، تردید کی جائے، صحیح بات پہنچانے کی کوشش کی جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات چپکے سے بھی تو کہی جاسکتی ہے، اور خدانخواستہ اگر ناانصافی، بے اعتدالی، عدم مساوات، حق تلفی، غیبت و چغلخوری و جعلسازی اور کھلے عام دھاندلی اور ظلم اصحابِ ثروت و مناصب اور اصحاب حیثیت و وجاہت اور دین داروں کی طرف سے ہو تو پھر تو زبان کھولنا بھی جرم، انگلی رکھنا بھی گناہ اور الدین النصیحة پر عمل بھی صریح گستاخی شمار ہوتی ہے، حالانکہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے:

أن رسول اللهؐ قام خطيبا فكان فيما قال "ألا لا يمنعن رجلا هيبة الناس أن يقول بحق إذا علمه۔ (ترمذی ۲/ ۳۰، ابن ماجه ۴۰۰۷)

(ترجمہ: اللہ کے رسول منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا: جس چیز کو تم قطعی و حتمی ہو اور حق جانتے ہو تو اس حق بات کو کہنے سے تم کو کسی شخصیت کا رعب و ہیبت نہ روکے، جس کو تم حتمی طور پر جانتے ہو)

حضرت ابوسعید خدری ہی یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں:

إن من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر (ابوداؤد ۴۳۴۴، ترمذی ۲۱۷۴، ابن ماجه ۴۰۱۱)

(ترجمہ: سب سے بڑا جہاد ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے)

اس دنیا میں انسان شتر مرغ کی طرح زندگی نہیں گذار سکتا کہ گھٹنوں میں گردن ڈال لے اور سمجھے کہ سب کچھ صحیح چل رہا ہے، نہ طاقت ور اور صاحب اختیار کمزور کو ستا رہا ہے، نہ حکومتیں ظلم ڈھا رہی ہیں، نہ اصحاب مناصب اپنے منصب کا بے جا استعمال کررہے ہیں، نہ اموال کے ذمہ داران بے محل صرف کر رہے ہیں نہ ہر چھوٹا بڑا صاحب اختیار اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کررہا ہے، اس دنیا میں عقابی نظر کے ساتھ جینا ضروری ہے، نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا واجب ہے، ورنہ لوگ بے نکیل اونٹ کی طرح جہاں چاہیں گے منہ ماریں گے، نظام کی چولیں ہل جائیں گے، انتظام دشوار ہوجائے گا، بے عملی و بدعملی کا چلن ہوگا، حق گوئی کی جگہ بدگوئی اور چاپلوسی محمود قرار پائے گی، بنی اسرائیل پر لعنت اسی لیے بھیجی گئی کہ انھوں نے برائیوں کی روک تھام سے کنارہ کشی کرلی، ان کے معاشرہ میں لوگ ظلم کرتے رہے، بے عملی کے مرتکب ہوتے رہے اور انھوں نے چشم پوشی سے کام لیا، نہی عن المنکر سے راہ فرار اختیار کی، آج ہماری قوم کی جو صورت حال ہے، زوال نے جس طرح ہر طرف سے اور ہر جگہ گھیر لیا ہے اس کی بڑی وجہ منکر کی نکیر نہ کرنا ہے، یہ سوچ کر چپ رہنا کہ ان کا عمل ہے وہ جانیں، وہ صاحب اختیار ہیں جو چاہیں کریں، ان

کا دائرہ کار ہے اس میں وہ آزاد ہیں، اس روش پر چلنے سے پہلے تو برائی کے اثرات لازم ہوتے ہیں، پھر متعدی ہوجاتے ہیں، ادارے کمزور پڑتے ہیں، تنظیمیں کمزور ہوتی ہیں، جماعتیں ٹوٹتی ہیں اور پھر من حیث القوم زوال مقدر ہوتا ہے حتی کہ وہ وقت آتا جس کی طرف حضرت عائشہؓ کی اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قالت سمعت رسول الله يقول "مروا بالمعروف، وانهوا عن المنكر قبل أن تدعوا فلا يستجاب لكم (ابن ماجه ٢٣٢٥)

(ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو قبل اس کے کہ تم دعا مانگو اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں)

معروفات کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سرفہرست توحید ہے اور پھر ہر اچھا کام معروف کی فہرست میں شامل ہے، اس طرح منکرات میں سرفہرست شرک ہے اور پھر ہر وہ عمل جو خلاف شرع اور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہو وہ منکر ہے، امر بالمعروف کا مطلب ہے نجات دلانے والی چیزوں کی طرف رہنمائی کرنا، خیر کی دعوت دینا، خیر کی طرف بلانا، کتاب وسنت کے مطابق جو بات ہو وہ معروف ہے، بندے کا جو قول و عمل اللہ کو راضی کرے وہ معروف ہے، اسی طرح منکر معروف کی ضد ہے، چنانچہ نہی عن المنکر کا مطلب ہے کہ جو چیز بھی شرعاً درست نہ ہو اس کی قباحتوں کو واضح کیا جائے، جو چیز بھی شریعت میں قابل نفرت ہو اس سے نفرت کی جائے، نفسانیت وشہوانیت اور خواہشات کی طرف اگر دل کا میلان ہو تو اس سے روکا جائے، ہر برائی سے روکا جائے، جو کچھ شریعت کے مزاج ومذاق کے موافق نہ ہو اس پر تنبیہ کی جائے۔

امر بالمعروف میں کوتاہی اور نہی عن المنکر سے فرار اختیار کرنا بلکہ اس کو تقریباً متروک کردینا امت کے اسباب زوال میں سے ایک اہم سبب ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے وجود سے پختہ اور محکم رائے بن سکتی ہے، ظلم سے پاک معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے، ادارے شاداب وثمر آور ہوسکتے ہیں تنظیمیں مضبوط وطاقتور ہوسکتی ہیں، اسی فریضہ کے ذریعہ امت کے فضائل واخلاق اور اس کی افضلیت کی حفاظت کی جاسکتی ہے، یہی وہ فریضہ ہے جو اس امت کی افضلیت کا سبب اصلی ہے، اگر یہ فریضہ انجام دیا جاتا رہے تو امت ترقی کرتی رہے گی، امت میں زندگی کے اسباب پیدا ہوتے رہیں گے دل دماغ چوکنا اور ضمیر بیدار رہے گا، امت کے اندر خصائل حمیدہ اور فضائل جنم لیں گے لیکن اگر اس سے پہلو تہی اختیار کی گئی جیسا کہ کی جارہی ہے تو پھر امت میں منکرات عام ہوں گے، پردۂ خفا میں رہنے کے بجائے سرِ راہ انجام دیے جائیں گے، رذائل کا چلن ہوگا، دل مضمحل اور دماغ کند ہوگا، بے ضمیری عام ہوجائے گی، سچی بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تفریق نہیں کی جاسکتی، طریقہ کار مختلف ہوسکتا ہے مگر دونوں میں سے کسی ایک کو متروک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی ایک سے اعراض ممکن ہے، دونوں کا مجموعہ اس امت کا فریضہ ہے، بنص قطعی یہی اس امت کی افضلیت وسعادت اور اس کے عروج اور سبز وشاداب زندگی کی ضمانت ہے، یقیناً غلط کو غلط کہنا بہت مشکل کام ہے، بسا اوقات غلط کہنے سے مخاطب کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور نکیر کرنے والا بھی مشکلات کا شکار ہوتا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ ؎

دل ٹوٹنے سے تھوڑی تکلیف تو ہوئی
لیکن تمام عمر کو آرام ہوگیا

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

وبائی امراض کی حقیقت اور اسلامی تعلیمات

مفتی محمد عارف باللہ القاسمی

کائنات کے احوال خالق کون ومکاں کی مشیت وتصرف سے تغیر پذیر ہوتے ہیں جس میں اس کی بہت سی حکمتیں و مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، ان ہی حکمتوں میں سے ایک حکمت ظالمین وجابرین اور منکرین حق کو سزا دینا اور ان کے دعوی قابلیت وصلاحیت کو بے وقعت و بے حیثیت بتانا اور ان کی عاجزی واحتیاج کو ثابت کرنا بھی ہے۔

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں سن لو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے: فافہم فافہم

اللہ عزوجل انسانوں کو ابتلاء وآزمائش کے طور پر جن چیزوں سے دوچار کرتے ہیں ان میں سے ایک اہم چیز مختلف قسم کی بیماریاں ہیں، بعض بیماریاں عام عادت انسانی کے مطابق موسمی تبدیلی اور جسمانی عناصر کے فطری توازن میں تغیر کا اثر ہوتی ہیں جو آتی ہیں اور جاتی ہیں اور ان کے علاج ومعالجہ سے انسان کی صحت مندی واپس آجاتی ہے، جبکہ بعض مروج بیماریاں بہت ہی تکلیف دہ اور مہلک ہوتی ہیں، لیکن ان میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد کی کمی اور دیگر انسانوں پر ان کے برے منفی نتائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیماریاں انسانی معاشرہ میں خوف وہراس اور بے چینی پیدا نہیں کرتی ہیں، لیکن بعض مرتبہ مرض ''وباء'' بن کر ظاہر ہوتا ہے، جس میں کبھی قابل علاج مرض ہلاکت خیز بن کر عام ہوجاتا ہے اور بڑے پیمانہ پر اس کی تباہی ظاہر ہوتی ہے تو کبھی کوئی ایسا ہلاکت خیز مرض بڑے پیمانہ پر عام ہوجاتا ہے جس کی دوا اس وقت اطباء کے پاس نہیں ہوتی ہے، اور اس سے بڑے پیمانہ پر لوگ متاثر ہوتے ہیں، ایسی صورت حال انسانوں کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتی ہے اور عمومی بے چینی کا باعث بن جاتی ہے، اس طرح کی ''وبا'' درحقیقت عذاب الٰہی ہے جو الٰہی غضب کو دعوت دینے والے برے اعمال کے عام ہونے کی وجہ سے انسانوں پر مسلط کیا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِي قَوْمٍ قَطُّ، حَتَّى يُعْلِنُوا بِهَا، إِلَّا فَشَا فِيهِمُ الطَّاعُونُ، وَالْأَوْجَاعُ الَّتِي لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِي أَسْلَافِهِمُ الَّذِينَ مَضَوْا (سنن ابن ماجۃ: ۹۱۰۴)

''جب بھی کسی قوم میں برائی علانیہ طور پر عام ہوجاتی ہے تو اس میں طاعون اور ایسے امراض عام ہوجاتے ہیں جو ماضی کے لوگوں میں نہیں تھے''

جب کوئی مرض ووبا انسانی بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب بن کر نازل ہوتا ہے تو گرچہ اس کے اثرات نیک وبد

دونوں پر پڑتے ہیں اور دونوں ہی قسم کے لوگ اس مرض ووبا میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہوتا ہے کہ ایک کے لئے عذاب تو دوسرے کے لئے رحمت ومغفرت کا باعث، ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

الطَّاعُونُ شَهَادَةٌ لِأُمَّتِي، وَرَحْمَةٌ، وَرِجْسٌ عَلَى الْكَافِرِ (مسند احمد:۲۴۶۷۰)

''طاعون میری امت کے لئے شہادت اور رحمت ہے اور کافر پر عذاب ہے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے طاعون کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اَنَّهُ كَانَ عَذَابًا يَبْعَثُهُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ، فَجَعَلَهُ اللَّهُ رَحْمَةً لِلْمُؤْمِنِينَ، فَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَقَعُ الطَّاعُونُ، فَيَمْكُثُ فِي بَلَدِهِ صَابِرًا، يَعْلَمُ اَنَّهُ لَنْ يُصِيبَهُ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَهُ، إِلَّا كَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِ الشَّهِيدِ (بخاری:۳۴۷۵)

''طاعون ایک عذاب ہے جسے اللہ جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے، پھر اسے مومنین کے لئے رحمت بنادیتا ہے، جو بندہ بھی طاعون میں گھر جائے اور صبر کا دامن تھامے ہوئے اپنے ہی شہر میں اس یقین کے ساتھ رہے کہ اس کے ساتھ وہی ہوگا جو اللہ نے اس کے لئے مقدر کررکھا ہے، تو اس کے لئے شہید کے جیسا اجر ہے''

اس حدیث سے جہاں وباء کی حقیقت معلوم ہوئی وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان والوں کے حق میں یہ وبائیں رحمت ہیں، نیز ایسی صورت حال میں ایمانی تقاضا یہ ہے کہ نظر تقدیر پر رکھی جائے اور اس جگہ سے کہیں دوسری جگہ جانے کے بجائے احتیاطی تدابیر کو اختیار کرتے ہوئے وہیں رہا جائے، اگر مقدر میں زندگی ہے تو اس وبا میں بھی وہ محفوظ رہے گا اور اگر تقدیر کے فیصلہ سے موت آبھی جاتی ہے تو یہ موت شہادت کی موت ہوگی اور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جن لوگوں سے قبر میں سوال وجواب نہیں ہوتا ان میں وہ شخص بھی ہے جس کی موت کسی طاعون ووبا میں ہوئی ہو۔ (حاشیۃ الطحطاوی:۷۱۶)

جس طرح وبا والی جگہ سے بھاگنے سے منع کیا گیا ہے اسی طرح اس جگہ جانے سے بھی منع کیا گیا ہے، سن ۱۴۴۱ ہجری میں جب ملک شام میں طاعون عام ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں جانے سے گریز کیا، جب صحابہؓ میں اس معاملہ میں مختلف باتیں شروع ہوئیں تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

اِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ، وَإِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ۔ (بخاری:۹۲۷۵)

''جب تم کسی مقام پر ''وبا'' کے بارے میں سنو تو وہاں مت جاو؟ اور اگر اسی مقام پر پہلے سے ہو تو اس کے خوف سے وہاں سے مت نکلو''

اس حدیث میں گویا احتیاط کی تعلیم کے ساتھ توکل اور تسلیم ورضا کی تعلیم ہے، وہاں نہ جانا ہلاکت سے بچنے کا سبب اختیار کرنا ہے اور اسباب اختیار کرنے کی تعلیم خود اسلام نے دی ہے اور یہ توکل کے منافی بھی نہیں ہے، اور اسی مقام پر رہنا توکل وتسلیم ورضا ہے، نیز دوسرے کی صحت اور ایمان کا تحفظ بھی ہے کہ اگر یہ شخص کہیں دوسری جگہ گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہاں بھی یہ وبا پھیلے، ایسی صورت میں اس کا بھاگنا مفید تو نہیں ہوگا البتہ اس اعتبار سے نقصاندہ ہوگا کہ وہاں کے لوگ اس وبا کو اس کی آمد سے جوڑیں گے اور ان کی نظر قضاء الٰہی سے ہٹ کر سبب ظاہری پر ٹک جائے گی، نیز امراض کے جراثیم میں بالذات نقصان ومرض کی تاثیر نہیں البتہ جس طرح اللہ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت دی ہے اسی طرح جراثیم میں اللہ

نے بیماریاں رکھ کر اسے بیماریوں کا سبب بنایا ہے، تو ہوسکتا ہے کہ اس کے جسم میں اس جگہ کچھ ایسے جراثیم پوشیدہ ہوں جو دوسرے مقام پر ''وبا'' کے پھیلنے کا ذریعہ بن جائیں، گویا اس کے وہاں سے نہ نکلنے میں توکل بھی ہے اور دوسروں کے تحفظ کا احتیاط بھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مقام وبا سے کہیں اور نہ جانے کا حکم ترغیبی نوعیت کا ہے، اس لئے فقہاء نے یہ تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس جگہ سے کہیں اور وباء سے بچنے کے لئے منتقل ہوتا ہے تو اس کا یہ عمل مکروہ ہے اور اگر اس خیال سے کہیں اور جاتا ہے کہ اس کا کہیں منتقل ہونا اسے بچانے والا نہیں بلکہ اللہ جو چاہے گا وہی ہوگا تو پھر اس جگہ سے اس کے منتقل ہونے میں کوئی حرج نہیں، اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کا پہلے سے کہیں جانا طے ہے اور وہ اپنے پروگرام کے تحت وہاں سے کہیں کا سفر کرتا ہے یا تجارتی اور معاشی ضرورت کی خاطر سفر ہے یا اسے اپنی ضرورت کی خاطر مقام وبا کو ہی جانا پڑ رہا ہے اور اس کا یقین ہے کہ اللہ نے جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا تو ایسے شخص کے لئے سفر کرنا اور مقام وبا سے نکلنا یا وہاں جانا درست ہوگا۔ وإذا خرج من بلدة بها الطاعون فإن علم ان كل شيء بقدر الله تعالى فلا باس بان يخرج ويدخل وإن كان عنده انه لو خرج نجا ولو دخل ابتلى به كره له ذلك (ردالمحتار:۶، ۷۵۷)

البتہ اگر کوئی شخص کسی متعدی مرض ووبا سے دور چار ہو چکا ہو تو اس کے ذمہ یہ احتیاط لازم وضروری ہے کہ دوسرے اس سے متاثر نہ ہوں، چناں چہ عوامی اجتماع یا وبا سے محفوظ مقام اور افراد کے درمیان اس کا جانا اگر ماہرین کی نظر میں اس بیماری کے پھیلنے اور دوسروں کے اس سے متاثر ہونے کا سبب ہو تو ایسے شخص پر لازم ہوگا کہ وہ خود کو اس مرض ووبا سے محفوظ مقام اور افراد سے دور رکھے؛ کیونکہ شریعت کا حکم ہے: لا ضرر ولا ضرار (نہ ضرر اٹھایا جائے اور نہ ہی ضرر پہونچایا جائے) اور چونکہ ماہرین کی نظر میں اس کا جانا اور صحت مند افراد سے اختلاط کرنا ان کے لئے باعث ضرر ہے تو ضرر رسانی سے بچنا اس کی ذمہ داری ہے، اور ایسے حالات میں ماہرین اور حکام کے مشوروں اور احکامات کو ماننا بھی شریعت میں لازم ہے، جیسا کہ علامہ بیری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ اگر طاعون ووبا کے ایام میں حکام کی طرف سے روزہ رکھنے کی ہدایت جاری ہو تو اس کی پیروی واجب ہوگی۔ لو امر بصوم ايام الطاعون ونحوه يجب امتثاله (ردالمحتار:۶، ۴۶۰)

جہاں تک احتیاط کی بات ہے تو اس سلسلہ میں اسلامی تعلیم یہی ہے کہ انسان کسی بھی نقصان دہ چیز سے حفاظت کے لئے حتی المقدور احتیاطی تدبیر اختیار کرے ساتھ ہی تقدیر وتوکل علی اللہ سے غفلت کا شکار بھی نہ ہو، احادیث میں جذام (کوڑھ) میں مبتلا شخص سے دور رہنے بلکہ ایک نیزہ دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے، بیمار اونٹ کو صحت مند اونٹ کے قریب لانے سے منع کیا گیا ہے، یہ سب درحقیقت اسبابِ حفاظت کو اختیار کرنے کی ہی تعلیم ہے، اس لئے کسی بھی مرض ووبا کے وقت ماہرین کے احتیاطی مشوروں پر عمل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ تقدیر پر کامل یقین بھی رکھنا چاہئے کہ ہماری احتیاطی تدبیریں درحقیقت ایک انسانی کوشش ہیں جن میں تقدیر محکم کو ٹالنے کی طاقت نہیں، اور اپنے کمزور اسباب کے ساتھ اللہ سے تعلق کو مستحکم کرنے کے لئے برائیوں سے توبہ واستغفار اور عبادات واذکار کا اہتمام بھی کرنا چاہئے؛ کیونکہ تعلق مع اللہ اور دعاؤں سے وہ سب کچھ ہوسکتا ہے جن میں اسباب وتدابیر بے بسی کا شکار ہوتے ہیں بلکہ دعاؤں سے ہی اسباب اور تدبیروں میں جان پڑتی ہے۔

☆☆☆

❑اسلامی تعلیمات

توکل وتدبیر کی اہمیت؛ حقائق کے آئینے میں

عبدالرشید طلحہ نعمانی

یہ دنیا عالم اسباب ہے اور سنت اللہ کے عین مطابق ان ذرائع واسباب میں مختلف قسم کی تاثیریں پنہاں ہیں؛لیکن ان تاثیرات کے ظاہر ہونے یا نہ ہونے کو حق تعالی نے اپنے حکم سے وابستہ فرما رکھا ہے۔ گویا کہ اختیارِاسباب کا حکم بجالانے کے باوجود مطلوبہ نتائج کا حاصل ہونا یا نہ ہونا مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ممکن ہے کہ مطلوبہ نتائج ہی حاصل ہوں،ممکن ہے کہ برعکس نتائج سامنے آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی نتیجہ ہی برآمد نہ ہو۔لہٰذا بندے کو اسباب اختیار کرنے کا حکم پورا کرنا چاہیے، البتہ نتائج کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد اور مکمل بھروسہ رکھنا چاہیے،اسی کا نام توکل ہے۔بالفاظ دیگر توکّل دراصل انسان کی باطنی کیفیت کا نام ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور عمل کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔''توکّل'' کا ذکر قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں کیا گیا ہے نیز اس کے اختیار کرنے پر دینی ودنیوی اعتبار سے کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کے لئے کافی ہوجائے گا، اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے''۔(طلاق)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''اگر تم حسن وخوبی کے ساتھ اللہ پر توکل کرو تو تمہیں اس طرح رزق دیا جائے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے، وہ صبح کے وقت خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کے وقت آسودہ ہوکر لوٹتے ہیں''۔(مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چل رہا تھا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: اے بچے تم اللہ کے حقوق کی حفاظت کروگے تو تم اللہ کو سامنے پاؤگے یعنی اللہ ہر جگہ تمہاری حفاظت و مدد فرمائے گا۔جب سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو! جب مدد چاہو تو صرف اسی سے مدد مانگو اور سنو! اگر پوری قوم تم کو نفع پہنچانے پر آمادہ ہوجائے تب بھی اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے اور اگر تمام لوگ تم کو کچھ نقصان پہنچانے پر لگ جائیں تب بھی اتنا ہی پہنچا سکتے ہیں جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہوگئے یعنی قضاء وقدر کا فیصلہ ہو چکا ہے

اسمیں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ (مشکوۃ)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ اللہ پر دل کے اعتماد کو توکل کہتے ہیں۔ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اللہ پر بھروسہ اور اپنی طرف سے عاجزی کو توکل کہتے ہیں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس بات کا یقین کہ موجودات میں صرف اللہ کی ذات موثر ہے کسی چیز کا نفع، نقصان، امیری، غریبی، صحت، مرض، حیات اور موت وغیرہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

توکل، تدبیر کے منافی نہیں!

توکل یہ ہے کہ اسباب اپنا کر بھی اعتماد اللہ تعالی پر ہو، اسباب کو محض ذریعہ سمجھا جائے اور موثر حقیقی اللہ رب العزت کو مانا جائے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالی ہے: پس جب اسباب اختیار کرلو تو پھر توکل اللہ تعالی پر کرو۔ (آل عمران: 159) اس طرح حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قوی مسلمان کمزور مسلمان سے اچھا ہے اور اللہ کو پیارا ہے۔ بھلائی سب میں ہے۔ اس پر حرص کرو جو تمہیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو، عاجز ہوکر مت بیٹھ جاؤ۔ اگر تمہیں کچھ تکلیف پہنچے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں وہ کام کرلیتا تو ایسا ہوجاتا؛ لیکن کہو کہ اللہ نے یہی مقدر کررکھا تھا جو اس نے چاہا؛ کیوں کہ اگر مگر شیطان کے کام کا دروازہ کھولتا ہے (مسلم) اس سے معلوم ہوا کہ توکل ترک اسباب کا نام نہیں اور نہ ہی کسی مومن کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ صرف اسباب پر بھروسہ کرلے اور مسبب الاسباب کو بھول جائے، چاہے وہ جائز اسباب ہی کیوں نہ اختیار کررہا ہو۔ کیونکہ اختیارِ اسباب تو ضروری ہے ہی؛ مگر اس کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اس یقین کا جاگزیں ہونا بھی ضروری ہے کہ ان اسباب میں تاثیر ڈالنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنی مایہ ناز تفسیر ''معارف القرآن'' میں ارقام فرماتے ہیں: ''توکل ترک اسباب اور ترک تدابیر کا نام نہیں؛ بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء اور تعلیمات قرآن کریم کے خلاف ہے'' (معارف القرآن) مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتماد کرتے ہوئے ان تمام تدابیر کو اختیار کرے جنہیں مشروع قرار دیا گیا ہے اور وہ تمام تدابیر جو بظاہر کتنی ہی موثر نظر آتی ہوں؛ مگر خلاف شریعت ہوں، انہیں اختیار کرنے سے باز رہے۔

غزوات اسلام میں توکل وتدبیر:

ہر مسلمان کا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ ساری انسانیت کے لیے تاقیامت مشعل راہ اور وسیلۂ نجات ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس حوالے سے ایک نظر نبی اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ پر بھی ڈالتے چلیں!

۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری جمعہ کا دن، نماز فجر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پرور، ولولہ انگیز اور موثر خطاب نے مجاہدین کو جوش وخروش سے لبریز کردیا ہے، صف بندی کا حکم دے دیا گیا ہے، آقا صلی اللہ علیہ وسلم صف بندی کررہے ہیں، فوج کو مورچے پر جمارہے ہیں، الگ الگ دستے بنارہے ہیں، ان کے کمانڈر متعین کررہے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں یہی وہ دن ہے جسے قرآن کی زبان میں ''یَوْمُ الْفُرْقَانِ'' یعنی حق وباطل میں فرق کا دن قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس غزوے کا دن ہے جو تمام غزوات میں سب سے افضل

ہے، جس کے شرکاء سب سے افضل ہیں، اوران کے بارے میں زبانِ نبوت سے وارد ہوا ہے: شاید اللہ نے اہل بدر کو دیکھ کر فرمایا: جو چاہو کرو، تمہارے لئے جنت واجب ہوچکی ہے، میں نے تمہاری مغفرت کردی ہے۔ (بخاری: المغازی: باب فضل من شہد بدراً)

ایک طرف یہ جنگی مستحکم، منظّم، مکمل اور حکیمانہ نظام وانتظام، وسعت بھر تیاری، تمام ضروری تدابیر واسباب ووسائل کا اہتمام، اور دوسری طرف آخری درجہ کے الحاح وتضرع کے ساتھ رجوع وانابت الی اللہ اور اللہ سے مدد طلبی اور اس پر توکل۔ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تدبیریں اور اسبابی انتظامات فرمائے، اونٹ، گھوڑے، تلوار، سب اسباب جمع کیے۔ اسباب کم ضرور تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب اسباب اپنائے، پھر اپنے رب کی طرف رجوع بھی فرمایا۔

غرض: غزوہ بدر کے اس فیصلہ کن موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل وتدبیر دونوں کو جمع کرکے یہ پیغام دیا ہے کہ ظاہری اسباب اور تیاری چھوڑ کر محض تقدیر پر تکیہ کرلینا بے عملی اور کم عقلی ہے، اور صرف اسباب وتدابیر کو اپنا کر اللہ کے دربار میں رجوع سے غافل رہنا محرومی اور نخوت ہے؛ بلکہ سنت رسول بتارہی ہے کہ اللہ پر توکل کی روح یہی ہے کہ تمام ممکن اسباب وتدابیر اپنا کر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے، اور اللہ کی طرف رجوع ہوا جائے، اور اسی سے مدد طلب کی جائے، اور دعا مانگی جائے، اس لئے کہ بابِ نصرت اسی دعا کے ہتھیار سے کھلتا ہے۔

غزوہ بدر میں امسلمانوں کے مقابل آنے والا لشکر ایک ہزار کا تھا، پھر غزوہ احد میں حملہ کرنے والا لشکر تین ہزار کا تھا۔ اس مرتبہ یعنی غزوہ خندق کے موقع پر لشکر کی تعداد بھی پہلی مرتبہ سے زائد تھی، سامان حرب بھی اور تمام قبائل عرب ویہود کی اتحادی طاقت بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس متحدہ محاذ کے حرکت میں آنے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلا کلمہ جو زبان مبارک پر آیا یہ تھا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل یعنی ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے''۔ اس کے بعد مہاجرین وانصار کے اہل حل وعقد کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا۔ اگرچہ صاحب وحی کو مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ براہ راست حق تعالیٰ کے اذن واجازت سے کام کرتے ہیں؛ مگر مشورے میں دو فائدے تھے۔ ایک امت کے لئے مشورہ کی سنت جاری کرنا، دوسرے قلوب مومنین میں باہمی ربط واتحاد کی تجدید اور تعاون وتناصر کا جذبہ بیدار کرنا۔ اس کے بعد دفاع اور جنگ کے مادی وسائل پر غور ہوا۔ مجلس مشورہ میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی شامل تھے جو ابھی حال میں ایک یہودی کی مصنوعی غلامی سے نجات حاصل کرکے اسلامی خدمات کے لئے تیار ہوئے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے بلاد فارس کے بادشاہ ایسے حالات میں دشمن کا حملہ روکنے کے لئے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دے دیا۔ اور بنفسِ نفیس خود بھی اس کام میں شریک ہوئے۔ گویا اس موقع پر بھی توکل وتدبیر کو ہم آمیز فرما کر امت کو اس بات کا سبق دیا کہ کامیابی کے واسطے دونوں ایک دوسرے کے لیے تقریباً لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد مشرکین طائف کے مقابلے میں تین گناہ زیادہ تھی، کفار چار ہزار

تھے؛ جبکہ مسلمان بارہ ہزار۔اس موقع پر مجاہدین اسلام کو اپنی ظاہری تعداد پر اعتماد ہوگیا کہ جب ہم کم ہوکر ہمیشہ فتح یاب ہوتے رہے ہیں تو آج زیادہ تعداد میں ہوکر فتح وکامیابی یقیناً حاصل ہوجائے گی۔ یہ تصور وخیال توکل کے منافی تھا اس کا فوراً نتیجہ ظاہر ہوا اور جنگ ہوتے ہی مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے حالانکہ نہ ان کے ایمان میں ضعف تھا نہ اللہ کی ذات پر یقین واعتماد میں شبہ۔بس اتنی بے احتیاطی ہوگئی تھی کہ کثرت کو فتح کا ذریعہ تصور کرلیا تھا اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں بیان فرمایا:''تم کو اللہ نے بہت سے موقعوں میں غلبہ دیا اور حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنے مجمع پر غرہ ہوگیا تھا پھر وہ کثرت کچھ کارآمد نہ ہوئی تم پر زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ ہوگئی' پھر تم پشت پھیر کر بھاگے۔''(سورہ توبہ)

ایک نصیحت آموز واقعہ:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ شب میں نفلیں پڑھنے مسجد کو تشریف لایا کرتے تھے،بعض حضرات نے ایک بار ان کو پہرا دیا، جب آپ نماز سے فراغت کے بعد باہر آئے اور ان لوگوں کو دیکھا،تو پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ آپ کی حفاظت کے لیے،حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آسمان والوں سے یا زمین والوں سے؟ لوگوں نے کہا کہ زمین والوں سے۔ یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب تک کسی بات کا فیصلہ آسمان میں نہیں ہوجاتا،اس وقت تک کوئی چیز زمین پر رونما نہیں ہوتی اور فرمایا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی لذت کوئی شخص اس وقت تک نہیں پاسکتا، جب تک یہ یقین نہ کرلے کہ جو کچھ (اچھا یا برا) اسے پہنچا ہے، وہ ہٹنے والا نہ تھا اور جو اسے نہیں پہنچا وہ اسے پہنچنے والا نہ تھا۔(تاریخ ابن عساکر)

توکل وتدبیر کے اقسام مع احکام:

توکل کی دو قسمیں ہیں:علماً اور عملاً۔علماً توکل تو یہ ہے کہ ہر امر میں متصرف حقیقی ومدبر تحقیقی حق جل شانہ کو سمجھے اور اپنے کو ہر امر میں ان کا محتاج اعتقاد کرے۔ یہ توکل تو ہر مرحلے میں فرض اور عقائد اسلامیہ کا جز ہے۔دوسری قسم عملاً توکل ہے جس کی حقیقت ترک اسباب ہے۔پھر اسباب کی دو قسمیں ہیں:اسباب دینیہ اور اسباب دنیویہ۔اسباب دینیہ جن کے اختیار کرنے سے کوئی دینی نفع حاصل ہو ان کا ترک کرنا پسندیدہ نہیں؛ بلکہ کہیں گناہ اور کہیں خسران وحرمان ہے اور شرعاً یہ توکل نہیں۔اور اسباب دنیویہ جس سے دنیا کا نفع حاصل ہو اس نفع کی دو قسمیں ہیں حلال یا حرام،اگر حرام ہو تو اس کے اسباب کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل فرض ہے۔اور اگر حلال ہو تو اس کی تین قسمیں ہیں (۱) یقینی (۲) ظنی (۳) اور وہمی۔

اسباب وہمیہ: جن کو اہل حرص وطمع اختیار کرتے ہیں جس کو طول امل یعنی لمبی امیدیں باندھنا کہتے ہیں،ان کا ترک کرنا ضروری ہے اور اس حوالے سے توکل فرض وواجب ہے۔

اسباب یقینیہ: جن پر وہ نفع عادۃً ضرور مرتب ہوجائے جیسے کھانے کے بعد آسودہ ہو جانا، پانی پینے کے بعد پیاس کم ہوجانا وغیرہ اس کا ترک کرنا جائز نہیں اور نہ یہ شرعاً توکل ہے۔

اسباب ظنیہ: جن پر غالباً نفع مرتب ہوجائے؛ مگر بار ہا تخلف بھی ہوجاتا ہو، جیسے علاج کے بعد صحت ہوجانا، یا نوکری اور مزدوری کے بعد رزق ملنا، ان اسباب کا ترک کرنا جس کو عرفِ اہل طریقت میں اکثر توکل کہتے ہیں اس کے حکم میں تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لئے تو جائز نہیں اور

قوی النفس کے لئے جائز ہے۔

اسی طرح تدبیر کے دو درجے ہیں: ایک اس کا نافع ہونا، دوسرا اس کا جائز ہونا، سو نافعیت میں تو یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ تقدیر کے موافق ہوگی تو نافع ہوگی ورنہ نہیں۔ اور اس کے جائز ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اس کے دو مرتبے ہیں: ایک مرتبہ اعتقاد کا یعنی اسباب کو منکرینِ تقدیر کی طرح تاثیر میں مستقل سمجھا جائے، سو یہ اعتقاد شرعاً حرام و باطل ہے، البتہ تاثیر میں غیر مستقل ہونے کا اعتقاد رکھنا اہل حق کا مسلک ہے۔ دوسرا مرتبہ عمل کا یعنی مقاصد کے لئے اسباب اختیار کئے جائیں سو اس کا حکم یہ ہے کہ اس مقصد کو دیکھنا چاہئے کیسا ہے سو اس میں تین احتمال ہیں یا وہ مقصد دینی ہے یا دنیوی، مباح ہے یا معصیت ہے، اگر معصیت ہے تو اس کے لئے اسباب کا اختیار کرنا مطلقاً ناجائز ہے اور اگر وہ دین ہے تو دیکھنا چاہئے کہ وہ امر دین واجب ہے یا مستحب۔ اگر واجب ہے تو اس کے اسباب کا اختیار کرنا واجب ہے اور اگر مستحب ہے تو اس کے اسباب کا اختیار کرنا مستحب ہے اور اگر وہ دنیاوی مباح ہے تو دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیاوی مباح ضروری ہے یا غیر ضروری، اگر ضروری ہے تو ان اسباب کو دیکھنا چاہئے کہ ان پر اس مقصد کا ترتب یقینی ہے یا غیر یقینی اگر یقینی ہے تو اس کے اسباب کا اختیار کرنا بھی واجب ہے اور اگر غیر یقینی ہے تو ضعفاء کے لئے اختیارِ اسباب واجب اور اقویاء کے لئے گو جائز ہے؛ مگر ترک افضل ہے۔ اور اگر وہ دنیاوی مباح غیر ضروری ہے تو اگر اس کے اسباب کا اختیار کرنا مضر دین ہو تو ناجائز ہے ورنہ جائز ہے، مگر ترک افضل ہے۔ (ملخص از بوادر النوادر)

آمدم برسر مطلب:

ان دنوں کرونا وائرس کے نام پر دنیا بھر میں جو اودھم مچی ہوئی ہے، اس سے ہر فرد بشر واقف ہے۔ اس وقت اللہ پر بھروسے کا پہلو خدا جانے کہاں غائب ہوگیا؟ ہر کوئی اسباب کا اسیر دکھائی دے رہا ہے۔ بیماریوں اور بالخصوص وبائی ومتعدی بیماریوں میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنا نہ صرف وقت کا تقاضا ہے؛ بل کہ شریعت کی نظر میں لازم ومطلوب بھی ہے، لیکن احتیاط کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کو دہشت زدہ کیا جائے، انہیں گھروں کی چار دیواری میں محصور کردیا جائے، مسجدوں میں باجماعت نماز پر پابندی عائد کردی جائے، جمعہ قائم کرنے کی بھی اجازت نہ دی جائے، حرمین شریفین جیسے مقدس مقامات کو ویران وسنسان کردیا جائے وغیرہ۔۔۔۔۔ فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے بقول اگر معاملہ اتنا ہی سنگین ہو تو صحیح طریقۂ کار یہ ہوسکتا ہے کہ لوگوں سے صابن کا استعمال کرتے ہوئے وضو کرنے اور گھروں میں سنتیں ادا کرکے آنے کی اپیل کی جائے، نماز کا وقفہ مختصر رکھا جائے، جس شخص کو نزلہ وزکام ہو اس سے کہا جائے کہ وہ گھر پر نماز ادا کرے اور مسجد نہ آئے۔ مساجد میں صفائی ستھرائی کا مکمل انتظام کیا جائے اور نمازیوں کو ماسک وغیرہ پہننے کا پابند بنایا جائے؛ مگر جماعتوں کو موقوف کردینا یہ علاج نہیں ہے، یہ تو بیماری ہے، روح کی بیماری اور ضعیف الاعتقادی کی بیماری۔ خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں نماز کی جماعت کو موقوف کردینا مستقبل میں بہت خراب نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔

☆☆☆

❑ ذکرِ حبیب

معراج کا واقعہ اور اس کا سبق

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپگڑھ

رجب کا مہینہ اسلامی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کے واقعہ معراج کے لیے جانا جاتا ہے۔ مشہور قول کے مطابق یہ واقعہ نبوت کے بارھویں سال اور رجب کی ستائیس تاریخ کو پیش آیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۱۵ سال پانچ ماہ کی تھی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری رح نے اپنی کتاب ''مہر نبوت'' میں تحریر فرمایا ہے:

اسراء کے معنی رات کو لے جانے کے ہیں، مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصی (فلسطین) کے سفر کا تذکرہ سورہ بنی اسرائیل (سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی) میں کیا گیا ہے اس کو اسراء کہتے ہیں اور یہاں سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے۔ معراج عروج سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، حدیث میں عرج بی (یعنی مجھ کو چڑھایا گیا) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس سفر کا نام معراج ہو گیا۔ اس مقدس واقعہ کو اسراء اور معراج دونوں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کا ذکر سورۂ نجم کی آیات میں بھی ہے۔ (ثم دنی فتدلی، فکان قاب قوسین او ادنی، فاوحی الی عبدہ ما اوحی) (پھر وہ قریب آیا اور جھک پڑا یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلہ کے برابر آ گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک، اس طرح اللہ کو اپنے بندہ پر جو وحی نازل فرمانی تھی وہ فرمائی۔)

اور سورۂ نجم کی آیات ۱۳ تا ۱۸ میں وضاحت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بڑی بڑی نشانیاں ملاحظہ فرمائیں۔ لقد رآہ نزلۃ (آخری الاخ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس (فرشتہ یعنی جبرئیل علیہ السلام) کو ایک مرتبہ دیکھا ہے۔ اس بیری کے درخت کے پاس جس کا نام سدرۃ المنتھی ہے۔ اس کے پاس جنت الماوی ہے، اس وقت بیری کے درخت پر وہ چیزیں چھائی ہوئی تھیں، جو بھی اس پر چھائی ہوئی تھی، (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) آنکھ نہ تو چکرائی اور نہ حد سے آگے بڑھی، سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بہت کچھ دیکھا۔)

یہ واقعہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے یعنی صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی تعداد سے اسراء و معراج کے تعلق سے احادیث مروی ہیں۔

تاریخ انسانی کا یہ سب سے لمبا سفر ہے۔ اس واقعہ کی معنویت پر ہزاروں صفحات لکھے گئے ہیں اور اس سے مستفاد عبر وموعظت کے بے شمار پہلوؤں کو مفسرین، محدثین اور علماء ربانی لکھتے رہے ہیں۔ جو کافی تفصیل طلب ہیں ہم یہاں انتہائی تلخیص کے ساتھ سفر معراج کے واقعہ کو متعدد اہل علم کی کتابوں سے مستفاد

کر کے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ کے اس عجیب وغریب اور بے مثال واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس عظیم الشان اور حیرت انگیز واقعہ کی تفصیلات سے واقف ہوں اور گناہوں سے پرہیز کریں جن کے ارتکاب کرنے والوں کا برا انجام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر امت کے سامنے بیان کیا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ حطیمِ کعبہ میں یا حضرت ام ہانیؓ کے گھر پر آرام فرما رہے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور نیند سے بیدار کیا، سینۂ مبارک کو چاک کیا، آب زمزم سے دھویا اور ایمان وحکمت سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت سینۂ مبارک میں انڈیل دیا۔ ان کے ساتھ ''براق'' نامی ایک تیز رفتار سواری بھی تھی، اس سواری سے آپ ﷺ بیت المقدس پہنچے، وہاں تمام انبیاءؑ انتظار فرما رہے تھے، آپ کے تشریف لاتے ہی صف بن گئی اور آپ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی گئی۔

یہاں سے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، اور آپ ﷺ حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ آسمان کی طرف تشریف لے گئے۔ جب پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا، فرشتوں نے پوچھا: کون؟ حضرت جبرئیلؑ نے اپنا نام بتایا، پھر پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہیں؟ حضرت جبرئیلؑ نے کہا: محمد (ﷺ)! پھر پوچھا گیا: کیا انھیں بلایا گیا ہے؟ کہا گیا: ہاں! پھر دروازہ کھلا، آپ ﷺ حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ اندر داخل ہوئے، یہی بات ہر آسمان پر پیش آئی۔

پہلے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، تیسرے پر حضرت یوسفؑ، چوتھے پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ اور ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی، آپ ﷺ نے ساتویں آسمان پر'' بیت المعمور'' دیکھا، جس کا ہر دن ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں۔

پھر اللہ کے رسول ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی، آگے بڑھ کر آپ ﷺ ''سدرۃ المنتھی'' پہنچے جس سے آگے فرشتے بھی نہیں جاسکتے۔ حضرت جبرئیلؑ یہیں رُک گئے؛ لیکن آپ ﷺ اس سے بھی آگے بلائے گئے، جہاں اللہ تعالی نے اپنے نبی سے بلاواسطہ (Direct) بات کی۔ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل ہوئیں اور پچاس نمازوں کا تحفہ دیا گیا۔ جب آپ ﷺ واپس ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ان کو پچاس نمازوں کے فرض ہونے کے بارے میں معلوم ہوا، تو بنی اسرائیل کے تلخ تجربہ کی روشنی میں انھوں نے مشورہ دیا کہ اللہ سیاس میں کمی کی درخواست کی جائے۔ آپ ﷺ بار بار کمی کی درخواست فرماتے رہے اور نمازیں کم کی جاتی رہیں، یہاں تک کہ پانچ رہ گئیں؛ لیکن یہ خوش خبری سنائی گئی کہ ثواب پچاس نمازوں ہی کا ملے گا۔

اتنا لمبا سفر چند لمحوں میں اللہ نے کرایا: آسمانوں کی سیر ہوئی۔ انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ جنت ودوزخ کے مناظر دیکھے۔ اللہ سے بات ہوئی اور نماز کا تحفہ لے کر واپس آئے..... یہ سب کچھ صرف چند لمحوں میں ہوا۔ جو لوگ غیبی نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے، اور خدا کی قدرت کو اپنی قدرت جیسا سمجھتے تھے، انھیں ان باتوں پر یقین ہی نہ آتا تھا، وہ مذاق اڑاتے، جھٹلاتے۔ لوگوں نے سوچا کہ یہی موقع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سچے دوست حضرت ابوبکرؓ کو بہکا دیا جائے، چنانچہ مکہ والوں نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس؛ بلکہ آسمان سے ہو کر آیا ہے تو یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہوگی؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ کہنے والوں نے کہا: محمد (ﷺ) آج یہی دعوی کر رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: اگر آپ ﷺ کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں۔ میں نے کبھی فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؛ لیکن میں اس بات کو مانتا ہوں کہ آپؐ

پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، تو آخر اس بات کو کیوں نہ مانوں؟ اسی موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو 'صدیق' کا خطاب ملا۔

یہ واقعہ کن حالات میں پیش آیا؟

مکی زندگی میں ظاہری طور پر آپ ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب اور بیوی ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کو بڑا سہارا تھا۔ حضرت ابوطالب کی وجہ سے آپ ﷺ کو اپنے قبیلے بنو ہاشم کی تائید اور سپورٹ (Support) حاصل تھا، اور حضرت خدیجہؓ چوں کہ مکہ کی ایک مالدار اور معزز خاتون تھیں، اس لیے مکہ کے مشرکین بھی ان کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچتے تھے۔ جب حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوگئی تو یہ ظاہری اسباب ٹوٹ گئے، اور مکہ والے آپؐ کو کھل کر ستانے لگے، تو اب ان کے حالات سے بدل ہو کر آپؐ طائف تشریف لے گئے کہ شاید انھیں ایمان کی توفیق ہو جائے؛ لیکن وہ مکہ والوں سے بھی زیادہ سخت دل ثابت ہوئے۔ انھوں نے آپؐ کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا، جس نے مکہ والوں کی زیادتی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ غرض کہ مصیبتوں، آزمائشوں اور پریشانیوں کی جب حد ہوگئی تو رسول اللہؐ کو ڈھارس بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو معراج کا شرف بخشا گیا۔

دو اہم سبق:

(۱) اس واقعہ میں ایک بڑا سبق ہے عقل کے پجاریوں کے لیے کہ جب کوئی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہو تو خواہ عقل اسے قبول کرے نہ کرے، مومن کو اسے قبول کرنا چاہیے؛ کیونکہ آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں، کان غلط سن سکتے ہیں، ذائقہ غلطی کرسکتا ہے، اور انسان کی عقل قدم قدم پر ٹھوکر کھا سکتی ہے؛ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی بات غلط نہیں ہوسکتی۔ اپنی معمولی سی عقل کی ترازو میں خدا کی زبردست قدرت کو تولنا ایسا ہی ہے جیسے رائی کو پہاڑ سے تولنا اور قطرے کو سمندر سے وزن کرنا۔

(۲) موجودہ دور میں بھی مکی زندگی کی طرح پوری دنیا کے مسلمانوں پر گھیرا تنگ کیا جارہا ہے۔ انھیں خوفزدہ کیا جارہا ہے۔ ان کے حوصلہ کو للکارا جارہا ہے؛ لیکن معراج کا واقعہ سخت حالات میں مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ وہ مصیبت اور مایوس کردینے والے حالات کی وجہ سے حوصلہ نہ ہاریں؛ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ اس طرح کے واقعات سے ان کا ایمان اور مضبوط ہوجائے اور ان کے یقین میں اضافہ ہو جائے۔ اس لیے کہ جس طرح رات کے اندھیرے کے بعد صبح کا اجالا پھیلتا ہے اور جیسے سخت گرمی کے بعد رحمت کی بارش ہوتی ہے، اسی طرح سخت حالات کے بعد اچھے حالات آتے ہیں اور حق کا چراغ پہلے سے اور تیز ہوجاتا ہے۔ (یہ خلاصہ امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ کے ہفت روزہ 'الجمعہ' سے پیش کیا گیا ہے)

اسراء ومعراج کا سفر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم اور حیرت انگیز معجزہ ہے جس پر عقل انسانی آج بھی دنگ اور حیران ہے۔ تاریخ انسانی کا یہ سب سے طویل اور حیران کن سفر ہے سائنس اور انسانی عقلیں ابھی اس کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ انتہائی کم وقت میں مسجد حرام سے بیت المقدس اور وہاں سے پھر آسمانی سفر سدرۃ المنتھی تک کی لمبی مسافت طے ہوجاتی ہے جس کا تذکرہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورہ نجم میں موجود ہے۔

معراج کا یہ واقعہ پوری تاریخ انسانی کا ایک ایسا عظیم، مبارک اور بے نظیر معجزہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے، خالق کائنات نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دے کر اور اپنا مہمان بنا کر وہ شرف عظیم عطا کیا، جو نہ کسی انسان کو کبھی حاصل ہوا اور نہ کسی مقرب ترین فرشتہ کو۔ اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مہمان کے شایان شان تحفہ اور ہدیہ نماز کی شکل میں دیا۔ دنیا میں بھی لوگوں کا دستور اور قاعدہ ہے کہ جب آنے جانے والا کسی کے گھر جائے تو لوگ کوئی نہ کوئی تحفہ دیتے ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قاب

قوسین سے زیادہ قریب ہوگئے تو اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کو نماز کا مبارک تحفہ دیا۔ نماز ایمان والو کے لئے بارگاہ خداوندی کا ایک عظیم تحفہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے طفیل مسلمانوں کو عطا کیا گیا۔ اگر ایمان والے اس تحفہ کی قدر کر لیتے اور آپ کے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز کو اپنی ٹھنڈک بنا لیتے تو آج امت کو یہ زوال، پستی ونکبت، بدحالی اور رسوائی کا منھ نہ دیکھنا پڑتا۔

جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا۔ (جب شعب ابی طالب کا مشکل و دشوار مرحلہ اور طائف کا کٹھن اور پیچیدہ دعوتی سفر بھی پورا ہو گیا) اور ہجرت کے بعد اطمنان وسکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا تو وہ شب مبارک آئی اور وہ ساعت ہمایوں آئی جس کو تاریخ انسانیت اسراء ومعراج کہتی ہے۔ معراج کا واقعہ ہم مسلمانوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر مسلمان صبر واستقامت اور عزم وہمت سے کام لیں، اپنے فرضی منصبی کو صحیح طور پر انجام دیں اور دعوت دین کو لوگوں تک دعوت وتبلیغ کی شرطوں اور تقاضوں کے ساتھ پہنچائیں تو ابھی جو دنیا میں مسلمانوں کی حالت ہے اور خاص طور پر ہندوستان میں میں جن مہیب اور مشکل حالات سے مسلمان گزر رہے ہیں یہ حالات ختم ہوجائیں اور پھر مسلمانوں کے لئے کوئی ساعت ہمایوں اور شب مبارک آجائے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رح نے واقعہ معراج کے حوالہ سے نکتہ کی دو باتیں لکھی ہیں۔ قارئین اسے بھی ملاحظہ فرمائیں مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''جس چیز کو ایک طرف سے دباؤ گے تو دوسری طرف اس کا ابھرنا ناگزیر ہے، آخر جو نیچے سے دبایا گیا اور مسلسل نہایت بے دردیوں سے دبایا گیا اور وہ دبتا ہی چلا گیا، کس قدر عجیب بات ہے کہ لوگ اسی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ ''معراج'' میں اوپر کی طرف کس طرح چڑھا، کیوں چڑھتا گیا، آخر جو درجہ نیچے دبایا گیا اسے حددرجہ اوپر ابھرنا ہی چاہیے تھا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

معراج کے موقع پر آسمانی سیر میں پہلے آسمان پر آدم علیہ السلام، دوسرے پر عیسی علیہ السلام و یحی علیہ السلام، تیسرے پر ادریس علیہ السلام، چوتھے پر حضرت ہارون علیہ السلام، پانچویں پر یوسف علیہ السلام، چھٹے پر موسی علیہ السلام اور ساتویں پر ابراہیم علیہ السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی۔ ہزار ہا پیغمبروں میں سے کل سات پیغمبروں اور ان میں بھی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر معمار کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کیوں ختم ہوگئی؟ اگر غور کیا جائے تو نکتہ کی بات سمجھ میں یہ آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جس طرح اپنے وطن جنت سے نکل کر دنیا کی ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ (وطن) سے نکل کر مدینہ پہنچے، مدینہ میں یہودی فتنے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح گھیرا جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام و حضرت یحیی علیہ السلام ان میں گھرے، حضرت ادریس علیہ السلام کتابت کے موجد تھے، غزوۂ بدر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں نوشت وخواند کو مروج کیا حتی کہ ہر قیدی سے دس بچوں کو لکھنا سکھا دینا فدیہ مقرر ہوا۔ پیغمبروں میں حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کے نام خطوط روانہ کئے، آگے جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل میں ہردلعزیز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں محبوب تھے۔ پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے وطن ثانوی مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا وہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دور ہجرت مدینہ منورہ میں چند سالوں کے بعد حاصل ہوگیا۔ پھر جس طرح حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے وطن فلسطین پر مصر سے حملہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ پر کیا''۔

☆☆☆

❑ نقد و نظر

فرہنگ نعت و سیرت

محبوب و محبّ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

ہندوستان کے ایک فاضل نعت نگار کا بہت مشہور شعر ہے:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا

(حدائق بخشش اول ص۲)

یہ شاعر موصوف کی ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ نما نظم کا ساتواں شعر ہے، یہ نظم طرح طرح کے معانی و مفاہیم پر حاوی ہے۔ نظم کا مطلع یوں ہے:

واہ کیا جودو کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

(ج۱،ص۱)

مکمل نظم کا تفصیلی جائزہ ان شاء اللہ کسی دوسرے موقع پر لیا جائے گا یہاں ایک ضروری بات جو قابل تحریر ہے وہ یہ ہے کہ اس طویل نظم کے ہر شعر کی ردیف ''تیرا'' ہے۔ ''تو، تیرا، تیری، تو نے، تجھ سے، تجھ کو'' یہ ضمیریں متکلم اپنے سے چھوٹوں کے لیے استعمال کرتا ہے نہ کہ بڑوں کے لیے، اور بڑا بھی کون؟ افضل البشر، سید الانبیاء، حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کی شان میں اس طرح کے الفاظ بولنا یا لکھنا انتہائی بے ادبی اور گستاخی کے مترادف ہے۔

ہمارے بچپن کے ایک استاد تھے مولانا محمد یوسف علیؒ (متوفی ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء) جنھوں نے شہر شاہجہاں پور کے محلّہ تارین ٹکلی کی مسجد میں کم و بیش پچاس سال بلا ناغہ ہر جمعے کو نماز جمعہ کے بعد قرآن پاک کی تفسیر بیان کی اور وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

روزِ قیامت ہر کسی در دست دارد نامہ ای
من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

استاد مرحوم بریلوی مکتبۂ فکر کے ایک جید عالم تھے، مگر آدمی تھے کھلے ذہن اور وسیع نظر کے مالک۔ ایک روز نعتیہ شاعری پر سلسلۂ کلام کے دوران انھوں نے راقم سطور سے فرمایا کہ اس نعت کی ردیف ادبِ نبویؐ کے خلاف ہے۔ فاضل بریلوی اس کو یوں بھی شروع کر سکتے تھے:

واہ کیا جودو کرم ہے شاہِ بطحا آپؐ کا
نہیں سنتا ہی نہیں ہے، ہے جو منگتا آپؐ کا

فاضل موصوف نے ایک جگہ اس مضمون کو اس طرح بھی باندھا ہے:

محبوب و محبّ کی ملک ہے ایک
کونین ہیں مالِ مصطفائی
(ج۲،ص۸۴)

محبوب، محبّ، حبیب، یہ سب الفاظ لفظ ''حب'' سے مشتق ہیں، جس کو محبت بھی کہتے ہیں اور ''محبت'' کے معنی قریب قریب سبھی لوگ جانتے ہیں، تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ''مالک'' کے معنی بھی سب کو معلوم ہیں، ملک، مملوک، ملکیت، یہ سب ایک ہی معنی کے لیے مستعمل ہیں یعنی وہ چیز جو کسی کے قبضے اور اختیار میں ہو، جس کا کوئی مالک ہو۔ جیسے یہ قلم راشد کی ملک ہے یعنی راشد اس قلم کا مالک ہے، اب اس شعر کو دوبارہ پڑھیے:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یوں محبوب و محبّ میں نہیں میرا، تیرا

یعنی چونکہ کائنات کی تمام چیزوں کا خالق و مالک اللہ ہے اور اللہ حضورؐ کا محبّ ہے، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالک (اللہ) کے حبیب (محبوب) ہیں، تو وہ بھی تمام کائنات کے خالق نہ سہی، مالک تو ضرور ہیں، اس لیے کہ بقول شاعر جس چیز کا مالک محبّ ہوتا ہے محبوب بھی اس کا مالک ہوتا ہے اور بالکل محبّ کی طرح محبوب بھی اس کی ملک پر قابض و متصرف ہوتا ہے، اس لیے کہ محبّ ومحبوب میں میرے تیرے کی کوئی بھی کشاکش نہیں ہوتی تو اب مطلب یہ نکلا کہ اللہ اور رسولؐ دونوں ہی بیک وقت و بیک طور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی شے کے برابر کے مالک ومتصرف ہیں۔ تقریباً یہی مفہوم دوسرے شعر سے بھی متبادر ہوتا ہے، یعنی محبوب ومحبّ دونوں کی ملکیت ایک ہی ہوتی ہے، تو پھر کونین کس کا مال ہوا؟ ظاہر ہے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

کاش ان بھولے بھالے قسم کے ''شاعروں'' کو اور ان کے ''غاویوں'' کو اتنا ہوش ہوتا اور اتنی فہم ہوتی کہ محبت کا یہ تصور ایک خالص عامیانہ، جاہلانہ، انسانی، میدانی تصور ہے، جب کوئی انسان اپنے ہی ہم جنس کسی (مذکر یا مؤنث) مادی وجود (انسان) کی محبت کی مستی میں پاگل یا نیم پاگل ہوجاتا ہے تو وہ اپنی ہر چیز محبوبہ یا محبوب کے ناز و ادا پر نچھاور کردیتا ہے اور اپنے تن، من، دھن کو اپنے منظورِ نظر کی ملکیت بنا دیتا ہے، ہمارے فاضل شاعروں منے اور ان کے ہم خیالوں نے خدا اور رسولؐ کی محبت کو بھی اسی پر قیاس کرلیا ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ یہ بدنصیب نہیں جانتے کہ: اللہ کی رسولؐ سے محبت، رسولؐ کی اللہ سے محبت، اللہ کی محبت عام انسانوں سے، عام انسانوں کی محبت اللہ سے، رسولؐ کی محبت عام انسانوں اور اپنی امت سے، امت اور امتیوں کی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ ان سب کی حیثیت اور نوعیت الگ الگ ہے۔

اللہ کی رسولؐ سے محبت:

یہ ہے کہ بے شمار انسانوں میں سے آپؐ کو اپنا کلام، پیغام اور اپنے احکام اپنے بندوں تک پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا: آپؐ پر اپنی آخری کتاب نازل فرمائی، آپؐ کو خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین اور شفیع المذنبین بنایا، جن و بشر سے ہی نہیں شجر و حجر سے، آپؐ کی رسالت کی گواہی دلوائی، "وانك لعلى خلق عظيم" کا تمغا عطا فرمایا، "ورفعنا لك ذكرك" کہہ کر قیامت تک کے لیے زمین و آسمان میں آپؐ کا آوازہ بلند فرمایا، کونین کی سروری عطا کی، معراج جسمانی سے سرفراز کیا اور جہاں تک اس کو منظور تھا آپؐ کو عالمِ بالا کی سیر کرائی، آپ کی ذات پر اپنے دین کی اور نبوت کی تکمیل فرمائی، غزوات میں فرشتوں کے ذریعے آپؐ کی اور آپؐ کے جان نثاروں کی مدد کی، قدم قدم پر دشمنوں سے آپؐ کی حفاظت فرمائی، اور "ولسوف يعطيك ربك فترضى" کا

دل نواز مژدہ سنایا اور.....۔

رسول کی اللہ سے محبت:

یہ ہے کہ خاندان، برداری اور زمانے بھر کی مخالفت اور دشمنی کے ماحول میں تن تنہا تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دیا، مشرکین قریش کی دھمکی سے متأثر ہو کر ابوطالب نے کچھ فہمایش کرنا چاہی تو جواباً آپؐ نے فرمایا کہ چچا! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ اس (اللہ کی طرف سے مقرر کردہ) کام کو چھوڑ دوں، تب بھی اس سے باز نہیں آؤں گا، یہاں تک کہ اللہ اس (دین) کو غالب کردے یا میں اسی راہ میں ہلاک ہوجاؤں۔ ۲۳ر برس تک مسلسل خطرات کے نرغے میں گھرے ہوئے رہ کر توحید و رسالت کی تبلیغ فرمائی، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور اللہ کے دین کو پوری دنیا میں پھیلانے کے لیے اللہ کی مدد اور اپنی اَن تھک جدوجہد کے ساتھ اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے کم وبیش سوا لاکھ انسانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی کہ انبیائے کرام کے بعد ان سے بہتر انسانوں کی جماعت روئے زمین پر کبھی وجود میں نہیں آئی۔ زندگی بھر اپنے قول و عمل سے بنی نوع انسان کو ہر طرح کی ہدایت اور کامرانی کے اصول سکھائے اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ قیامت تک دنیا کے کام آنے والا مکمل منشور حیات اللہ کے بندوں کی دسترس میں پہنچا کر "الرفیق الاعلیٰ" کی طرف رخصت ہوگئے۔

عام انسانوں سے اللہ کی محبت:

یہ ہے کہ: ان کو خلوت کدۂ عدم سے کارگاہ ہستی میں جلوہ گر کیا، اور "ولقد کرمنا بنی آدم" کا تاج ان کے زیب سر کیا، پیدا ہونے سے پہلے ماؤں کے سینوں میں دودھ کی نہریں جاری کردیں، چاند، سورج، ہوا، پانی، زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزیں ان کی ضرورت و راحت کے لیے پیدا فرمائیں۔ ان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے زمین سے غلہ اگایا اور ہزار ہا نوع بہ نوع اشیاے خورد و نوش کو پیدا فرمایا۔ سردی گرمی وغیرہ سے بچنے کے جملہ وسائل مہیا فرمائے، بیماریوں سے شفایابی کے لیے دوائیں پیدا کیں۔ غرض کہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے پیری تک کے تمام مراحل میں ان کے ہمہ نوعی استفادے کے لیے بے شمار چیزیں پیدا کیں اور اپنی نعمتوں سے ان کے دامن حیات کو مالا مال کردیا، ان کی ہدایت اور ان کو آداب بندگی سکھانے کے لیے ایک لاکھ سے زیادہ انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا، دنیا کی ہر قوم میں ایک ہادی بھیجا تاکہ ان کو خدا کے احسانات کی قدر شناسی اور اپنے منشائے وجود کی تکمیل کے اطوار و اوضاع کی تعلیم دے اور ان کے دل و دماغ کو میثاقِ ازل کی پاس داری پر آمادہ کرے۔

عام انسانوں کی اللہ سے محبت:

یہ ہے کہ: اللہ کی یکتائی، اس کی قدرت، اس کی خالقیت، اس کی رازقیت، اس کی الوہیت، اس کی حاکمیت، اس کی مالکیت، اس کی ربوبیت اور اس کی ارحم الراحمینی کے ساتھ ساتھ اس کے حبیب اور عبد خاص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت اور آپؐ کی خاتم النبیین و رحمۃ للعالمینی کی تحریریں لوحِ دل پر اذعان و ایقان کے قلم سے مرتسم کی جائیں اور مہد سے لحد تک زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور آپؐ کی تعلیمات پر عمل کرکے اللہ سے اپنی محبت کا ثبوت دیں اور اپنے مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرتے ہوئے ہر حال میں اپنے قول و عمل سے یہ اظہار و اعلان کرتے رہیں:

گونجتا ہے مرے کانوں میں ازل کا اقرار
اپنے وعدے سے بھلا کیسے مکر جاؤں میں
(ر-ن-ا)

رسولؐ کی امت اور امتیوں سے محبت:

یہ کہ آپؐ نے خدا کے حکم اور اس کی مدد سے، بے شمار مرئی اور غیر مرئی دیوی دیوتاؤں اور کنکروں، پتھروں کی پوجا پاٹ سے ہٹا کر، خدائے واحد کی پرستش کا خوگر بنایا، نہ صرف اصطلاحی امت بلکہ تمام انسانی ملت کو صلاح و فلاح دینا اور نجات عقبیٰ سے ہمکنار کرنے والے ایک مؤمنانہ و موحدانہ نظام کی تشکیل کی اور اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے آپؐ کی دل سوزی اور فکر مندی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے نے آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا: لعلك بٰخع نفسك ان لا يكونوا مومنين (شاید تم اس غم میں اپنی جان دے دو کے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔) (سورۃ الشعراء، آیت ۳)۔ فتح مکہ کے موقع پر "لاتثريب عليكم اليوم" (آج تم پر کوئی الزام نہیں) فرما کر اپنے جانی دشمنوں تک کے ساتھ عفو و احسان کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر دنیا کی پوری تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ یہ بھی امت اور انسانیت کے ساتھ محبت کا ہی ایک مظہر ہے۔ امت سے محبت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ عرب کے بادیہ نشینوں کو ایک مختصر سی مدت میں ایسے آداب سیادت و قیادت اور وہ آئین و اصول حکومت سکھائے جو آج بھی دنیا کے لیے قابل رشک اور لائق تقلید ہیں اور اس سے بھی بڑا امت سے آپؐ کی محبت کا اشاریہ یہ ہے کہ امت کی نجات کے لیے آپ اکثر بارگاہ الٰہی میں دعا فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ بعض تفسیری روایات میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ "ولسوف يعطيك ربك فترضىٰ" (آپؐ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔) (سورۃ الضحیٰ، آیت ۵) تو آپؐ نے فرمایا کہ: "اِذا لا ارضى و واحد من امتى فى النار" (یعنی جب یہ بات ہے تو میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری امت کا ایک بھی آدمی جہنم میں رہے گا)۔ (معارف القرآن، ج ۸، ص ۷۶۶) [1]

امت اور امتیوں کی رسولؐ سے محبت:

یہ ہے کہ: بعثت کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک (پورے ۲۳ رسال) آپؐ نے امت اور امتیوں کو جن باتوں کی تعلیم دی اور اپنے عمل سے ان کو متشکل کر کے بھی دکھایا، امت کو بھی چاہیے کہ ان قولی اور عملی تعلیمات پر ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ اپنی جان پر کھیل جائے مگر عقیدہ، رسالت و آخرت کی حفاظت اور اُسوۂ رسولؐ کی اطاعت سے دست بردار نہ ہو، دینی احکام کی بجا آوری میں ذرا سی بھی کوتاہی روا نہ رکھے اور ایمان و اخلاق کے خلاف کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہ کرے جس پر دنیا کو انگلی اٹھانے کا موقع ملے اور جس طرح آپؐ زندگی بھر امت کی فلاح و بہبود اور اس کی نجات اخروی کے آرزومند اور اس کے لیے دعا گو رہے، اسی طرح امت بھی آپؐ کی اطاعت اور نوامیس شریعت حمایت و حفاظت کے لیے پورے شعور کے ساتھ بہ وقت ضرورت اپنی دنیاوی آسایشوں کو قربان کرنے کے لیے آمادہ رہے۔ اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ اپنے دل میں آپؐ کی محبت کو جگہ دے اور کثرت سے آپؐ پر درود بھیجنے کو اپنی مستقل عادت بنالے۔

ہم نے سطور بالا میں محبت کی امکانی صورتوں کی یہ تفصیل اس لیے سپرد قلم کی ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث میں ہم کو کہیں بھی شاعروں کی مفروضہ محبت اور محبوب و محبّ کی ملک کے ایک ہونے یا کونین کے مالِ مصطفائی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اوپر نقل شدہ دونوں شعروں کے علاوہ انھیں شاعر موصوف کے اسی دیوان (حدائق بخشش) کے کچھ شعر اور بھی مطالعہ کر لیجئے اور ساتھ ہی قرآن پاک کی چند آیات بھی ملاحظہ فرمائیے اور یہ بات ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں نقش کر لیجئے کہ اسلام میں پاگلوں مجذوبوں کی قطعاً کوئی

فضیلت نہیں ہے۔ قرآن اہل عقل وشعور کو اپنا مخاطب بناتا ہے جذب وجنون کا قصیدہ کہیں نہیں پڑھتا۔

ہاں، تو فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسرواعرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا
(ج۱،ص۲)

آسماں خوان، زمیں خوان، زمانہ مہمان
صاحبِ خانہ لقب کس کا ہے تیرا، تیرا
(ج۱،ص۲)

میری تقدیر بری ہے تو بھلی کردے کہ ہے
محو و اثبات کے دفتر پہ کڑوڑا تیرا
(ج۱،ص۳)

ہے ملک خدا پہ جس کا قبضہ
میرا ہے وہ کامگار آقا
(ج۱،ص۱۶)

وہی نورِ حق، وہی ظلِ رب، ہے انھیں سے، ہے انھیں کا سب
نہیں ان کی ملک میں آسماں، کہ زمیں نہیں کہ زماں نہیں
(ج۱ص۶۶)

جن و بشر سلام کو حاضر ہیں السلام
یہ بار گاہ مالکِ جن و بشر کی ہے
(ج۱،ص۱۳۲)

سب بحر و بر سلام کو حاضر ہیں السلام
یہ بارگاہ مالکِ ہر خشک و تر کی ہے
(ج۱،ص۱۳۲)

عرش تا فرش ہے جس کے زیر نگیں
اس کی قاہر ریاست پہ لاکھوں سلام
(ج۱،ص۳۷)

محترم شاعر کے ان آٹھوں اشعار میں محبوب یا محبّ کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے، لیکن ہر شعر میں وہی محبوب ومحبّ کی ملک کے ایک ہونے کا نظریہ کارفرما ہے۔ بلکہ معاملہ کچھ آگے تک بھی پہنچ گیا ہے:

(۱) ''خسرواعرش پر اڑتا ہے پھریرا تیرا'' یعنی عرش اعظم کے اوپر اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ دنیا والے تو آپؐ کی شان وشوکت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے جب کہ ملأ اعلیٰ نے خود آپ کی شوکت اور دبدبے سے عاجز ہوکر عرش پر خدا کی جگہ آپؐ کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔

(۲) ''آسمان خوان.....صاحب خانہ'' زمین اور آسمان کس کا دسترخوان جس پر مہمان بن کر زمانہ طرح طرح کی نعمتوں کا مزہ لے رہا ہے، یہ کس نے بچھایا ہے؟ رسولؐ نے! اس بے کراں گھر کا میزبان اور مالک کون ہے؟ رسول اللہ!

(۳) ''میری تقدیر.....کڑوڑا تیرا''، ''کڑوڑا'' کے معنی ہیں وہ شخص جس کے ماتحت کئی حاکم ہوں، بڑا عہدہ دار ہے، اور ''محو واثبات کے دفتر'' سے لوح محفوظ مراد ہے (یا اور کوئی بڑا سا رجسٹر مراد ہوگا جس میں بزعم شاعر تقدیروں کی تحریر اور ادل بدل ہوتی ہوگی) تو مطلب یہ ہوا کہ تقدیر کا بنانا بدلنا سب حضورؐ کے اختیار میں ہے کیونکہ لوح محفوظ کا انچارج بھی حضورؐ کا گماشتہ ہے اور آپؐ جب بھی اس کو حکم دیتے ہیں وہ خدا کی مقدر کردہ تقدیر کو الٹ پلٹ کر کے آپؐ کی مرضی کے مطابق کر دیتا ہے۔ اس لیے فاضل شاعر خدا کی جگہ حضورؐ سے دعا کر رہا ہے کہ میری تقدیر خراب ہے تو اس کو بہتر بنا دیجئے کیونکہ لوح محفوظ کا نگرانِ اعلیٰ بھی آپ ہی کا گماشتہ اور آپؐ کا دست نشاندہ ہے۔

(۴) ''ہے ملک خدا پہ جس کا قبضہ.....''۔ یعنی خدا کی ساری

ملک ومملکت جس کے قبضے میں ہے وہ بقول شاعر حضورؐ ہیں جو شاعر کے آقا ہیں۔

(۵) ''وہی نور حق وہی..... کہ زماں نہیں''۔یعنی آپؐ ہی نور حق اور ظل رب ہیں اور دنیا میں (یا کائنات میں) جو بھی کچھ ہے سب آپؐ ہی کا مال ہے زمین، زمان، آسمان میں کونسی چیز ایسی ہے جو آپؐ کی ملکیت سے باہر ہو۔

(۶) ''جن و بشر.....'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار تمام جنات اور انسانوں کے مالک کا دربار ہے، اسی لیے جن اور انسان سب وہاں سلام کرنے کے لیے حاضری دیتے ہیں۔

(۷) ''سب بحرو بر.....'' یعنی آپؐ کا دربار، دنیا کے تمام بحرو بر کے مالک کا دربار ہے اور یہ تمام بحرو بر کے مالک ہیں اس لیے سارے سمندر اور خشکی کے علاقے آپؐ کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔

(۸) ''عرش تا فرش.....'' یعنی آپؐ ایسی زبردست حکومت (حکومت قاہرہ) کے مالک ہیں کہ عرش سے فرش تک جو بھی کچھ ہے وہ سب آپؐ کے قبضے اور تصرف میں ہے۔

فاضل ذی جاہ کے ان تمام اشعار کا مطلب انھیں دو شعروں کے مفہوم کی توسیع یا تفصیل ہے جو ہم نے آغاز تحریر میں نقل کیے ہیں اور یہ سارا شاخسانہ اسی شرک آمیز عقیدے کا کرشمہ ہے کہ: ''یعنی محبوب ومحبّ میں نہیں میرا تیرا''۔

بے شک آپؐ اللہ کے حبیب (یا محبوب) ہیں اور اللہ آپؐ کا محبّ ہے لیکن آپؐ اللہ کے مخلوق اور اس کے عبدِ خاص بھی ہیں اور آپؐ کی پوری زندگی اللہ کی عبدیت کاملہ کی مظہر تھی۔[۳]

ہمارے فاضل یگانہ اور موصوف کے ہم عقیدہ تمام شاعروں اور ان کے قارئین وسامعین کی بنیادی فریب خوردگی یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ اللہ کی محبت کو دو عام انسانوں کی محبت پر قیاس کرلیا گیا ہے اور قیاس کے نشے میں ایسے مست ہیں کہ قرآن پاک کی بالکل واضح ہدایات کو بھی نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ عقیدہ یا نظریہ قرآن پاک کی بہت سی آیتوں کے خلاف ہے اگر ان فریب خوردہ لوگوں کا خیال درست ہوتا تو قرآن پاک میں ایسی آیات نہ ہوتیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- لہ مافی السمٰوات والارض من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی (اللہ) کا ہے، کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کسی کی سفارش (شفاعت) کر سکے۔) (سورہ بقرہ، ۲۵۵)

۲- لیس لك من الامر شئ او یتوب علیهم او یعذبهم فانهم ظٰلمون۔ (آپؐ کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، خدا چاہے تو ان کو توبہ کی توفیق دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے کہ وہ ناحق پر ہیں۔) (آل عمران، ۱۲۸)

۳- قل لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا الا ماشاء اللہ (آپؐ کہہ دیجئے کہ مجھے اپنی ذات کے لیے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں ہے، مگر جو اللہ چاہے۔) (الاعراف، ۱۸۸)

۴- افانت تسمع الصم ولوکانوا لا یعقلون۔ (کیا آپؐ بہروں کو سنا سکتے ہیں، خواہ وہ بے عقل ہوں؟) (سورہ یونس، ۴۲)

۵- أفأنت تهدی العمی ولوکانوا لا یبصرون۔ (کیا آپؐ گمراہوں کو ہدایت دے سکتے ہیں، اگرچہ وہ دیکھتے نہ ہوں؟) (سورہ یونس، ۴۳)

۶- ولا تقولن لشائ انی فاعل ذلك غدا، الا ان

یشاء اللہ۔ (کسی بھی چیز کے بارے میں آپؐ ہرگز یہ نہ کہیے کہ کل میں یہ کام کروں گا، مگر یہ کہ اللہ اگر چاہے۔) (سورہ کہف، ۲۳-۲۴)

۷- انك لا تسمع الموتى ولا تسمع الصم الدعاء۔ (بے شک نہ مُردوں کو آپ سنا سکتے ہیں اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں۔) (النمل، ۸۰)

۸- وما انت بهٰدی العمی عن ضلالتهم۔ (اور آپؐ راہ سے بھٹکے ہوئے اندھوں کو کچھ نہیں دکھا سکتے۔) (النمل، ۸۱)

۹- قل لله الشفاعة جميعا، له ملك السمٰوات والارض۔ (آپؐ کہہ دیجئے کہ شفاعت کی اجازت دینے کے تمام اختیارات صرف خدا کو ہیں، آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک صرف وہی ہے۔) (الزمر، ۴۴)

۱۰- له مقاليد السمٰوات والارض۔ (آسمانوں اور زمین کی کنجیاں صرف اسی (اللہ) کے پاس ہیں۔) (الزمر، ۶۳)

۱۱- ان الله يسمع من يشاء وما انت بمسمع من فی القبور۔ (اللہ جس کو چاہتا ہے سناتا ہے، آپؐ قبر والوں کو کچھ نہیں سنا سکے۔) (سورہ فاطر، ۲۲)

۱۲- يايها النبی لم تحرم ما احل الله لك (اے نبیؐ! آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے؟) (التحریم، ۱)

۱۳- انك لا تهدی من احببت ولكن الله يهدی من يشا (اے نبیؐ! آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔) (القصص، ۵۶)

۱۴- ماكان للنبی والذين آمنوا ان يستغفروا للمشركين ولو كانوا اُولی قربیٰ (نبیؐ اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں یہ زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔) (سورہ توبہ، ۱۱۳)

قرآن پاک کی یہ آیات چند نکات کی توضیح کرتی ہیں:

(۱) خالق کائنات نے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء اور خاتم النبیین بنا کر پیدا کیا اور تمام مسلمان دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ: ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' لیکن تمام انسانوں اور جنات کی ہدایت اور تبلیغ رسالت کی ذمہ داریاں تفویض کرنے کے باوجود اپنی مالکیت، حاکمیت، الوہیت اور اپنی قدرت ومشیت اور نظامِ کائنات کی مدبریت و مدیریت کے کسی ادنیٰ سے معاملے میں بھی اپنا شریک وسہیم نہیں بنایا ہے اور قضا وقدر اور مخلوقات کے نفع وضرر کے بارے میں آپؐ کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

(۲) خاص ہدایت ورہبری کے معاملے میں بھی، ہدایت دینا نہ دینا اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اختیار میں رکھا ہے اور آپؐ کو صرف تبلیغ وتلقین کی ذمہ داری سپرد کی ہے۔

(۳) آپؐ کو یہ قدرت بھی نہیں دی گئی ہے کہ بہروں کو یا مُردوں کو اپنی آواز ہی سنا سکیں یا اندھوں کو راہ دکھا سکیں، یہ سب امور بھی اپنے اختیار میں رکھے ہیں، یہاں تک کہ کسی کے حق میں شفاعت کے لیے بھی اپنے حکم اور اپنی اجازت کی شرط عائد کردی ہے، خدا کے اذن کے بغیر کوئی بھی کسی کی بھی شفاعت نہیں کر سکے گا، خود نبی کریمؐ کو اپنے خاص چچا (ابوطالب) کے حق میں دعائے مغفرت کرنے تک سے روک دیا گیا ہے۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شخصی نفع اور نقصان کا مالک بھی نہیں بنایا، بلکہ اللہ نے آپؐ کو حکم دیا کہ یہ اعلان

کر دیجئے کہ میں سید الانبیاء والمرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین ہو کر بھی یہ اختیار نہیں رکھتا کہ خود اپنی ذات کو بھی نفع یا نقصان پہنچا سکوں۔

(۵) کسی کام کو دوسرے دن کرنے کا ارادہ کرنے کے بعد اس کو زبان لانے کے لیے نبی کریمؐ کو تاکید کی گئی کہ ''ان شاء اللہ'' کہے بغیر آپؐ ہرگز ایسا نہ کہیں کہ میں کل کو یہ کام کروں گا۔

(۶) کسی چیز کے حرام کرنے کا آپؐ کو کوئی حق یا اختیار نہیں دیا گیا جس کو اللہ نے حلال کر دیا ہے۔

القصہ: ہمارے شاعروں اور ان کے غاویوں کا یہ عقیدہ یا نظریہ یا خیال یا تصور قطعاً وحتماً غلط ہے اور شرک کے دائرے میں آتا ہے کہ ''اللہ چونکہ آپؐ کا محبّ ہے اور آپؐ اس کے محبوب ہیں، اس لیے اللہ نے تمام کائنات کو پیدا کر کے آپؐ کو اس کا مالک و مختار بنا دیا ہے اور تمام اشیائے عالم پر آپؐ کا قبضہ اور اختیار ہے اور آپؐ اپنی مرضی سے دنیا کے ہر شے پر تصرف کا حق رکھتے ہیں'' (العیاذ باللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اپنے اختیارات منتقل نہیں کیے بلکہ ہر نبی کو اور خود امام الانبیاء والمرسلین کو بھی لا الہ الا اللہ (اس کے متعلقات اور لوازمات) کی تبلیغ کا ذمہ دار بنایا تھا، عقیدہ توحید و رسالت کی اشاعت کے فرایض تفویض فرماتے تھے، اپنے کسی اختیار و اقتدار میں قطعاً شریک نہیں فرمایا تھا، محبوب و محبّ کا ایسا عقیدہ رکھنے والے ہر شخص کو توبہ اور استغفار (بلکہ تجدید ایمان) کرنا چاہیے۔ (ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ توفیق نصیب فرمائے۔) (آمین) (قلم زندہ تحریر باقی)

حواشی

(۱) یہ حدیث اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے، مگر کسی نے واضح طور پر حدیث کی کسی معتبر کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ متعدد کتب تفسیر میں تلاش کیا گیا، کہیں کوئی مستند حوالہ نہیں ملا۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے قرطبی کا حوالہ دیا ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی کی کتاب الجامع لاحکام القرآن راقم کی دسترس میں نہیں ہے، پھر وہ بھی تفسیر کی کتاب ہے اور قرطبی مفسر ہیں، محدث نہیں ہیں۔

(۲) سعیدی ڈکشنری، ص ۸۶۳۔ فرہنگ آصفیہ والے نے بھی یہی معنی اپنے انداز میں اور زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔

(۳) کتب سیرت کا بکثرت مطالعہ کرنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ بخاری، مسلم وغیرہ میں بہت سی احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک بے شمار مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپؐ کو اپنے مخلوق خدا اور بندۂ خدا ہونے کا اور اس کا شریک و سہیم نہ ہونے کا بخوبی علم تھا اور ہر وقت احساسِ عبدیت کا غلبہ رہتا تھا۔

مراجع

۱- القرآن العظیم

۲- معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، کتب خانہ محمودیہ، دیوبند، تاریخ ندارد

۳- حدائق بخشش، احمد رضا خاں فاضل بریلوی، رضا اکیڈمی ممبئی، ۲۰۰۱ء

۴- چراغ نوا، رئیس احمد نعمانی، علی گڑھ ۲۰۰۰ء

۵- سعیدی ڈاکشنری، محمد منیر صدیقی لکھنوی، مطبع مجیدی، کانور ۱۹۴۰ء

☆☆☆

❑تعلیم و تربیت

نوعمر بچوں کا نظم ونسق پر توجہ نہ دینا

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

عام طور پر نوعمروں اور ان کے والدین کے درمیان کشیدگی اور مشکل کا سب سے بڑا جو سبب بنتا ہے وہ نوعمروں کا اپنی ضرورت کی چیزوں کی تنظیم وترتیب پر توجہ نہ دینا ہے، بہت سے والدین اس کی شکایت کرتے ہیں، بعض مرتبہ تو بعض مائیں یہاں تک کہتی ہیں: ''میری بیٹی نے تو اپنی غفلت و بے توجہی کے سبب مجھے پاگل کر دیا ہے''، ''میرے بیٹے کا کمرہ ہمیشہ اتھل پتھل رہتا ہے، کبھی مرتب اور منظّم نہیں رہتا''، ''میں نے بیٹی سے ایک ہزار بار کہہ دیا ہے کہ اس طرح ڈائننگ ہال میں کتابیں پھیلا کر نہ چھوڑا کرو مگر وہ کسی طرح سنتی ہی نہیں''۔

پریشانی اور غصہ کے ساتھ والدین کی شکایتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ خود سے ہی سوال کرتے ہیں: ''آخر یہ (لڑکا/لڑکی) اس بات کو سمجھتا کیوں نہیں، ہمیشہ غفلت و بے توجہی برتتا ہے، کمرے کو کوڑے دان بنا کر رکھتا ہے، جبکہ انسان کے لیے یہ کس قدر آسان ہے کہ اپنی چیزوں کو استعمال کر کے فوراً سلیقہ سے اپنی جگہ پر رکھ دے''، ''آخر وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ کیا محض عدم اطاعت و نافرمانی کے جذبہ سے ایسا کرتا ہے؟ یا پھر سرکشی میں قصداً ایسا کرتا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے؟''

بہت سے والدین یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سلوک و برتاؤ میں زوجین کے درمیان ہمیشہ اختلاف کے برے اثرات خود ان کی ازدواجی زندگی پر بھی پڑے ہیں اور نو عمر بچے کی غفلت و بے توجہی کا سبب بھی بنے ہیں۔

یہ مشکل مزید پریشان کن تب ہو جاتی ہے جبکہ بچہ اس حد تک بدنظمی اور بے ترتیبی پر اتر آتا ہے کہ میلے کپڑے زمین پر پھینک دیتا ہے، ان کو ان کی مخصوص جگہ پر دھونے کے لیے رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا، ماں یا باپ اسے ملامت کرتے ہیں کہ اس کے کپڑے گندے ہیں، قصہ یہ ہے کہ عام طور پر والدین بھول جاتے ہیں کہ جب وہ خود اس بچے کی عمر میں تھے تو کیسے تھے، اور پھر اس سے ان کاموں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کو نوعمری کے مرحلہ میں انھوں نے خود نہیں کیا۔

اگر آپ کو لگتا ہے کہ ترتیب وصفائی اہم امور میں سے ہے، اور کپڑوں کو دھونے کے لیے ہمیشہ ان کی مخصوص جگہ پر (یعنی اس کے لیے مخصوص باسکٹ میں) ہی رکھنا چاہیے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ گھر میں روزانہ ایک متعین روٹین پر عمل کیجئے، اس طور پر کہ چند منٹ اس کے لیے خاص کر دیجئے کہ اس وقت بچوں کے ساتھ مل کر تمام میلے کپڑے جمع کر دیے جائیں گے، اس کا بہتر وقت شام کا ہوگا، جبکہ بچے دن بھر

گندے کیے گیے کپڑے تبدیل کرتے ہیں، اب سب کو معلوم ہوگا کہ یہ وقت دھلے جانے والے کپڑوں کو ایک جگہ پر جمع کرنے کا ہے، اس طرح امید ہے کہ زمین پر کپڑے ڈالنے کی عادت میں بڑی حد تک کمی آ جائے گی خواہ پورے طور پر یہ مشکل ختم نہ ہو۔

بعض والدین پوچھتے ہیں کہ اگر بے ترتیبی اور صفائی نہ کرنے پر نوعمر بچوں کو کچھ سزا دی جائے، مثلاً ان کو جیب خرچ نہ دیا جائے یا اس میں کچھ کٹوتی کر لی جائے، اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ سزا تب ہی بہت زیادہ سودمند ہوتی ہے جب کہ جس عمل پر سزا دی جارہی ہے اس سے سزا کا تعلق واضح ہو، اگر کام کی نوعیت سے سزا کا کوئی براہ راست تعلق ہی نہ ہو تو پھر یہ سزا صرف اور صرف والدین اور بچوں کے مابین تعلقات کی خرابی و کشیدگی کا سبب بنے گی، فرض کیجئے کہ اگر بچہ مطلوبہ کام انجام نہیں دیتا ہے اور آپ نے اس کو اس ہفتہ جیب خرچ (Pocket Money) نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو کیا آپ آئندہ ہفتہ یعنی دوسرے، تیسرے اور چوتھے ہفتہ بھی آپ ایسا کر سکیں گے؟؟ ظاہر ہے کہ اکثر والدین نوعمر بچوں کے ساتھ اس طرح کی معرکہ آرائی پسند نہیں کرتے جس سے بچے کے اندر قبول کی صلاحیت کے بجائے اس کے انکار و عناد میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔

بہتر سزا کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا ذکر اس کتاب کے آئندہ صفحات میں اپنے مقام پر آئے گا، بہتر سزا وہی ہوتی ہے جو کام کے فطری نتائج کے موافق ہو، چنانچہ اگر بچے نے گندے کپڑے گندے کپڑوں کی باسکٹ (Basket) میں نہیں رکھا، تو اس کے کپڑے نہیں دھلے جائیں گے، بس یہی سزا کافی ہوگی، اگر اس نے کپڑے زمین پر ڈال کر چھوڑ دیے، تو وہ تب تک زمین ہی پر پڑے رہیں گے جب تک وہ خود نہ اٹھائے، پھر جب صاف اور پریس کیے ہوئے کپڑے مانگے گا اور چیخے گا تو از خود اپنی غفلت، بے ترتیبی اور والدین کے ساتھ تعاون نہ کرنے کا نتیجہ دیکھے گا اور اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

یہ تو تب ہے جبکہ اس کو سزا دینے کا ارادہ ہو، ورنہ اگر سزا دینے کا ارادہ نہیں تو پھر عام صورت حال کی طرح کپڑے دھوئے جائیں اور پریس کیے جائیں، اس میں کوئی آپ کا بہت زیادہ وقت نہیں خرچ ہوگا کہ آپ خود ہی اس کے کپڑے اٹھا کر دھو ڈالیں، یہ ایک طرح سے بچے کا تعاون ہوگا، آپ اس سے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''اگر تم اپنے گندے اور اتارے ہوئے کپڑے باسکٹ میں رکھ دو تو یہ تم اپنی ماں کے اس کام میں تعاون کرو گے جو بہر حال وہ انجام دیتی ہیں''، اس طرح سے اس کو اپنے شوق سے کام کرنے اور آپ کا تعاون کرنے کا حوصلہ ملے گا نہ کہ صرف واجب کی ادائیگی جو اس کے لیے اس مرحلہ میں بہر حال مشکل ہوتی ہے، پھر اگر وہ ''بھول'' جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ والدہ خود ہی اس کام کو کر لیں، جو والدین بھی اس طرح کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ جلد ہی ان کے بچے خود ہی اپنی ذمہ داریوں کو یاد رکھنا شروع کر دیتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہوئے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں کہ ان کے والدین اس سلسلہ میں زیادہ پیچیدگی نہیں پیدا کرتے، وہ جب بھی دھلے ہوئے اور پریس کیے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں تو والدین سے ملنے والی رعایت کی قدر کرتے ہیں، پھر جلد ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ بچے اپنے والدین کے تعاون کو سعادت و خوش نصیبی سمجھتے ہیں، کیونکہ والدین نے ان کو اس کام کے لیے مجبور نہیں کیا، پھر دن بہ دن والدین و اولاد کے درمیان یہ جذبۂ تعاون مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

بہت زیادہ بحث و تکرار اور ردّ و کد ترتیب و نظم کے سلسلہ میں مفید نہیں ہوتی، بعض والدین تو ہفتہ میں ایک آدھ گھنٹے ترتیب و نظم کے سلسلہ میں ردّ و کد میں ہی لگا دیتے ہیں، نتیجہ سوائے غصہ اور پریشانی کے کچھ نہیں نکلتا، گویا اختتام اس طرح ہوتا ہے جیسے انھوں نے کسی سے بات نہ کی ہو بلکہ دیوار سے سر ٹکرایا ہو۔

ہم پہلے یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ عمر کے اس مرحلہ میں بچے کو استقلال و آزادی بہت عزیز ہوتی ہے، اس استقلال کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ مثلاً اس کا علیٰحدہ کمرہ خاص ہو (اگر اس کی فیملی کے لیے یہ ممکن ہو)، وہ اپنے کمرے کو جس طرح چاہے مرتب (Set) کرے، جس کی ترتیب و تنظیم پر اسے کوئی مجبور نہ کرے۔

ایسا نوجوان بچہ جو اس ماحول میں پروان چڑھا ہو، جس ماحول میں تنظیم وترتیب اور نظم ونسق کو اس لیے بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ اس سے انسان کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے، تو غالب گمان یہی ہے کہ نوعمری کے مرحلہ میں بھی وہ ان امور کو انجام دینے کے فوائد کو محسوس کرے گا، اگر اس جانب توجہ دینے میں وہ غفلت کرے گا تو جلد وہ بے اطمینانی اور پریشانی کے احساس سے دوچار ہوگا، اس طرح وہ سیکھے گا کہ صفائی ستھرائی کے اہتمام پر کس طرح پابندی سے توجہ دینا چاہیے اور کس طرح نظم ونسق اور ترتیب کا ہمیشہ اہتمام کرنا چاہیے۔

یہ بات تو اس کے اپنے کمرے سے متعلق ہوئی، جہاں تک گھر کے دوسرے حصوں کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے لیے خاص نہیں ہیں، وہ سب کے لیے مشترک ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھے اور ان کے ساتھ تعاون کرے، والد کو بحیثیت والد اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ گھر کے دوسرے حصوں کی ترتیب وصفائی میں اس طرح کی غفلت اور بے توجہی نہ برتنے پائے جس طرح اپنے کمرے میں کرتا ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کبھی کبھی اپنی بعض ضروری چیزوں کو اپنے سامنے میز یا زمین پر رکھ کر چھوڑ دینا پسند کرتا ہے، بالخصوص تب جب کہ ہم بہت تھکے ہوئے ہوں یا طویل وقفہ کے بعد آرام کرنا چاہتے ہوں، صحیح بات یہ ہے کہ انسان اگر اپنے گھر میں من چاہے طریقہ سے آرام نہیں کرے گا تو اور کہاں کرے گا؟ ظاہر ہے کہ گھر ہمارے لیے ہے، ہم گھر کے لیے نہیں کہ ہر وقت اسی کی خدمت کرتے رہیں، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں، کبھی اس کو چھوڑ دیں کہ اپنی چیزیں جہاں چاہے رکھ دے بالخصوص جب وہ آرام وسکون کے لیے کوشاں ہو، البتہ اگر معاملہ بڑھ جائے اور وہ تسلسل سے ایسا کرنے لگے تو آپ مزاحیہ انداز میں یا لطیفہ کے اسلوب میں اس کو اشارہ کر دیں اور اس جانب توجہ دلا دیں، بہتر یہ ہے کہ اس طرح کا انداز اختیار کریں: ''ایسا لگتا ہے کہ ہمارے گھر کے لوگ (فیملی) کبھی کبھی بے ترتیبی پسند کرنے لگتے ہیں''، جس وقت آپ یہ بات کہیں اس وقت خود اپنی بعض اشیاء کو عملاً مرتب بھی کریں، یہ طریقہ اس طرح کی عبارتوں سے کہیں زیادہ مؤثر ہوگا ''دیکھو ذرا میں کس قدر صاف ستھرا ہوں اور چیزوں کو کس حد تک مرتب رکھتا ہوں، تم اپنے آپ کو دیکھو غفلت میں پڑے ہو، کوئی پرواہی نہیں، کوئی چیز بھی مرتب نہیں ..... معلوم نہیں تم کب بڑے ہوگے اور میری طرح بنو گے''۔

جو شخص صرف ''کمال'' (Perfection) پر ہی یقین رکھتا ہو، ممکن ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بہت کامیاب اور خوش بخت ہو، مگر اس کے ساتھ ایک ہی گھر میں دوسروں کا رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

نوعمروں کی خصوصیات:

اگر ایسا ہو کہ آپ نوعمر بچے کے کمرے میں داخل ہوں اور آپ کی نظر اس کی کسی ایسی چیز پر پڑے جس کو آپ نہ دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

آپ کو اس پر ضبط کرنا چاہیے، جو ناپسندیدہ چیز آپ نے دیکھی وہ اگر ضائع کرنے یا جلانے کے لائق ہے تو آپ اس کو ضائع کر دیں اور اس موضوع پر اس سے کوئی بات نہ کریں، وہ بھی اس سے متعلق کچھ نہیں پوچھے گا، گویا اس طرح خاموشی ہوگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

لیکن یہ رویّہ متعدد اسباب کی وجہ سے درست نہیں قرار دیا جاسکتا، پہلی بات یہ ہے کہ بچے کا کمرہ بچے کا ہے، یہ ہمیں گوارا ہو یا نہیں مگر حقیقت یہی ہے، اس کمرے میں جو چیزیں ہوں گی وہ اسی کی ملکیت ہوں گی، اب اس کے خاص امور میں آپ کی دخل اندازی اور اس کی اپنی چیزوں میں بغیر اس کی اجازت کے چھیڑ چھاڑ سے اس کو پریشانی ہوگی اور اس سے وہ سخت غصہ ہوگا، اور فی الحقیقت اس خاموش واقعہ کا اثر بہت دنوں تک بچے اور اس کے والدین کے تعلقات پر رہیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ برتاؤ بچے کو مسلسل ایسا کرنے سے روک نہیں سکے گا، البتہ اس کو یہ تجربہ ضرور ہوجائے گا کہ اپنی اس طرح کی چیزوں کو آپ کی نظروں سے دور اور چھپا کر رکھے، یعنی آئندہ وہ سلسلہ میں مزید محتاط ہوجائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر بہت سے والدین ایسا کیوں کرتے ہیں کہ بچوں کی خاص چیزوں کو خاموشی سے تلف کردیتے ہیں اور ان سے اس کے متعلق گفتگو بھی نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو راز ان پر منکشف ہوا اس کے سلسلہ میں وہ اس سے بات کرنے میں حرج محسوس کرتے ہیں، بحیثیت والدین وہ اپنے بچے کی تربیت میں اپنی کوتاہی اور اپنے گناہ کا بھی احساس کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اسی کوتاہی کے سبب بچہ اس عمل کا مرتکب ہوا، وہ جانتے ہیں کہ اس طرح بچے کی ٹوہ میں نہیں لگنا چاہیے اور تجسس نہیں کرنا چاہیے، لیکن جب بات سامنے آہی گئی تو پھر وہ عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ مسئلہ کا آسان حل تلاش لیں اور اس پر کسی طرح کی گفتگو نہ کرکے موضوع کو دبا دیں۔

اگر بچے کے کمرے میں آپ کو کوئی ایسی چیز ملے جس کو وہ آپ کی نظروں سے دور رکھنا چاہتا ہو تو آپ اپنے آپ سے سوال کیجئے، کہ یہ چیز اس کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ؟ اگر وہ نقصان دہ نہ ہو تو من وعن اسے اپنی جگہ پر چھوڑ دیجئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں، لیکن اگر آپ کو لگتا ہے کہ یہ چیز اس کے لیے نقصان دہ ہوگی تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ آپ اس سے گفتگو کریں خواہ اس موضوع پر اس سے بات کرنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، لیکن کوشش کیجئے گفتگو آپسی تکرار اور چیلنج کے انداز میں نہ ہو، مثلاً اس سے اس طرح گفتگو نہ شروع کریں: ''آؤ تم سے ایک بہت اہم اور خطرناک موضوع پر بات کرنا ہے، آؤ دروازہ بند کرو اور میرے سامنے بیٹھ جاؤ، یہ دیکھو آج تمہارے کمرے میں مجھے کیا ملا ہے، یہ معاملہ واقعی شرمناک اور بہت معیوب ہے، افسوس ہے تم کس قدر نافرمان اور پریشانی کا باعث بن چکے ہو''۔

یہ انداز بچے کو مزید یہ کام کرنے پر آمادہ کرے گا، البتہ وہ بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ آپ سے بچ کر رہے گا تاکہ دوبارہ آپ کو معلوم بھی نہ ہوسکے، اس لیے بہتر انداز یہ ہوگا کہ آپ پورے اطمینان کے ساتھ وضاحت سے بچے کے جذبات سمجھتے ہوئے اس طرح گفتگو کیجئے: ''آج غلطی سے مجھے تمہارے کمرے میں یہ چیز مل گئی، مجھے اس کے ملنے پر حیرت تو ہوئی، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سے نوجوان اپنی بڑھتی عمر کے اس مرحلہ میں ان معاملات کے بارے میں سوچتے ہیں''۔

اس انداز سے اگر بغیر کسی تناؤ اور ٹکراؤ کے بات کی جائے گی تو اس سے بچے کی زندگی میں والد کے اثرات کا بھی اضافہ ہوگا، اور پھر مستقبل میں بھی اس کو صحیح انداز میں موثر طریقہ سے وہ رہنمائی کرسکیں گے۔

جہاں تک نوعمر بچوں کی آزادی کی خواہش کا سوال ہے، آپ کبھی کبھی دیکھیں گے کہ بچہ پہلے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے، جیسے ہی آپ داخل ہوئے وہ منٹ دو منٹ بعد کمرے سے نکل جائے گا، اور گھر میں کسی دوسری جگہ جاکے بیٹھے گا، جب ایسا کئی بار ہوگا تو آپ اس پر توجہ دیں گے، پھر آپ اپنے دل میں سوچیں گے کہ آخر کیا وجہ ہے، کیوں یہ آپ سے دور بھاگ رہا ہے، اس کو آپ سے کیا پریشانی ہے؟ آپ کو اس

خیال سے مزید تکلیف ہوگی کہ آپ کا لڑکا آپ کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہتا، آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا، لیکن درحقیقت یہ کوئی بری بات نہیں ہوگی، کیونکہ نوجوان نوعمری کے اس مرحلہ میں ایک ایسے مرحلہ سے گذرتا ہے جب اس کو اپنے افکار کے ساتھ تنہا بیٹھنے میں مزا ملتا ہے، وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک پختہ فکر اور پختہ کار انسان کی طرح سوچے، ہرگز اس کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ اپنے والدین سے دوری بنائے، البتہ اس کی نئی شناخت اور آزادی کی خواہش اس کو خود بخود اس رویہ پر مجبور کرتی ہے، وہ اپنی شخصیت کے اس نئے رنگ کو اپنے والدین سے دور تنہائی میں یا اپنے دوستوں اور ہمجولیوں کے درمیان محسوس کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ گھر والے اس کی اس ضرورت کو محسوس بھی نہیں کرتے ہیں کہ جس وقت وہ تنہائی میں اپنے افکار و خیالات کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہو، اس وقت خاموش رہیں اور کم از کم اس سے گفتگو نہ کریں، ماں یا والد یا دونوں کے ساتھ اس کے بیٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاموش نہیں رہ سکتا، تنہا اپنے افکار کی دنیا میں مگن نہیں ہوسکتا، اس کو بہرحال ساتھ بیٹھ کر والدین کی باتوں کا جواب دینا پڑے گا، اس لیے اس کے سامنے ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ والدین کے پاس سے اٹھ کر خالی کمرے میں چلا جائے اور اپنے خیالات کی دنیا میں تنہا جیئے۔

اگر آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا بچہ اس مرحلہ سے گذر رہا ہے، جہاں بھی جاتا ہے اپنی تنہائی و عزلت پسندی ساتھ لے جاتا ہے، اور آپ چاہتے ہیں کہ یہ کسی مشکل اور بڑی پریشانی کا سبب نہ بنے، تو آپ بغیر کسی روک ٹوک اور رائے زنی کے اس کو یہ موقع دیجئے کہ وہ اپنے خیالات سے متعارف ہوسکے اور اپنی شخصیت کے نئے رنگ سے واقف ہوسکے، اگر آپ نے اس کو متہم کرنا شروع کیا کہ تم ہمارے ساتھ بیٹھتے نہیں یا اس طرح کی کوئی بھی بات آپ نے کہنا شروع کی تو پھر اس مشکل میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا، ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نوعمروں کے اندر محبت، نفرت اور دوستی یا دوری اور چڑھ وغیرہ کے جذبات دیرپا اور یقینی نہیں ہوتے، بسا اوقات اس کے یہ جذبات پَل پَل میں بدلتے ہیں، چنانچہ اگر آپ نے اس کو کوئی الزام دیا یا اس سے حقیقت حال بیان کرنے کا مطالبہ کیا تو پھر وہ ان جذبات کی سچائی و حقیقت کو لے کر مزید تشویش میں مبتلا ہوجائے گا، آپ کا الزام یا استفسار اس کو یہ سوچنے پر مجبور کردے گا کہ وہ واقعی آپ کو چاہتا ہے کہ نہیں، جبکہ پہلے وہ خود سے یہ سوال نہیں کرتا رہا ہوگا، وہ تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ بے شک وہ آپ سے محبت کرتا ہے اور آپ کا احترام کرتا ہے، جبکہ آپ کو اس میں شک ہو رہا ہوگا، اور اسی بنا پر آئندہ وہ بھی آپ کے اس شک میں آپ کا شریک بن جائے گا، پھر اس کے ذہن کا یہ خلجان اور اس کی یہ تشویش اس کو آپ سے مزید دور کردے گی، وہ اور زیادہ کنارہ کشی کرے گا، اس کی سوچ کچھ اس طرح کی بن جائے گی کہ گویا جب بھی وہ آپ کے قریب آتا ہے آپ اس کے احساسات و جذبات کی حقیقت پر کھنے لگتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طرح کے موقف اور میل جول و برتاؤ سے کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔

نوعمر بچوں کو صبح بیدار کرنا:

نوعمری یا عنفوان شباب کے مرحلہ میں نوعمر بچوں کے لیے صبح کے وہ لمحات بہت خوشگوار ہوتے ہیں جبکہ وہ بیدار ہونے کے بعد بھی بستر پر لیٹے رہتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں، نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے مشکل یہ تھی کہ بچہ صبح کے وقت بالخصوص چھٹی کے دن اپنے بستر پر یا کمرے میں رکتا نہیں تھا، جبکہ چھٹی کے دن گھر کے دیگر افراد نمازِ فجر کے بعد دوبارہ سونے اور آرام کرنے کے خواہاں ہوتے تھے، البتہ اب یہی بچہ نوجوانی کے مرحلہ میں صبح کو اپنے لحاف سے نکلنا نہیں چاہتا، اچانک اس تبدیلی کی خاص وجہ تیزی سے اس کا جسمانی

نمو ہے، جس کے سبب وہ کچھ زیادہ سونا چاہتا ہے، پھر یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ پہلے کے بالمقابل اس مرحلہ میں وہ کچھ تاخیر سے سوتا ہے، اس موقع پر جو چیز معاون ہوسکتی ہے وہ یہ کہ بڑوں کو یہ ادراک ہوجائے کہ نوجوان کے اندر نشاط و زندگی کے لیے اس طرح کی نیند ضروری ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ بہت سے والدین کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کچھ دیر زیادہ سوتا ہے لیکن کچھ والدین اس پر سخت اعتراض کرتے ہیں، خاص طور پر تب جبکہ نماز فجر کے بعد والد گھر کے بعض کاموں میں مصروف ہوتے ہیں اور نوجوان بچہ دوبارہ گہری نیند کے آغوش میں چلا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ نوجوان بچہ بھی جلدی بستر چھوڑنے پر قادر ہوتا ہے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کو ایسا کرنا ہی ہے جیسے کہ اسکول کے دنوں میں وہ کرتا ہے، یا دیگر ضروری کاموں کے لیے وہ ایسا کرتا ہے، اس لیے اس رویّہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے، بس صرف سارا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس مرحلہ میں کچھ اضافی نیند کا لطف لینا چاہتا ہے۔

صبح کو بیدار ہونے سے متعلق اہم بات یہ ہے کہ اسکول جانے کے لیے یا کسی اور اہم متعین عمل کے لیے اس کو جگانے کی ذمہ داری والدین کو نہیں لینا چاہیے، یہاں اعمال کے فطری نتائج والے اصول کو برتنا مفید ہوگا، یعنی اس کو چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے اعمال و برتاؤ کے نتائج کا خود سامنا کرے، دراصل ان چیزوں کا تعلق اوقات کا لحاظ اور اوقات کی پابندی سے ہے، اگر والدین نے اس کے اوقات کے لحاظ و پابندی کو اپنے ذمہ لے لیا تو پھر وہ کبھی بھی وقت کی پابندی کرنا نہیں سیکھے گا، وہ تو اس ذمہ داری کو والدین کے سپرد کرنے میں ہی عافیت اور راحت محسوس کرے گا، کیونکہ اس کو یہ یقین ہوگا کہ جب تک والدین یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں اس کو کچھ سوچنے کی ضرورت ہے ہی نہیں۔

اب اگر اس نے طے ہی کرلیا ہے کہ اس طرح وقت ضائع کرے گا، یا وہ بستر پر پڑا رہنے کے سبب اپنے روٹین کے کاموں میں یا اسکول جانے میں لیٹ ہوتا ہے، تو اس کو چھوڑ دیجئے کہ وہ اپنے کیے کا نتیجہ بھگتے، اگر وہ اسکول جانے میں لیٹ ہوتا ہے تو آپ کو یہ نہیں کرنا ہے کہ آپ جلدی سے اس کی طرف سے عذر پیش کرنے اسکول پہنچ جائیں، اس کی تاخیر کے لیے آپ جا کر اعذار پیش کرنے لگیں، اگر آپ نے ایسا کرلیا تو وہ کبھی بھی اپنے کرتوتوں کا نتیجہ نہیں بھگتے گا اور نہ ہی وہ اعمال کے نتائج کا سامنا کرنا سیکھے گا، آپ کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ صبح کو بس ایک بار اسے پکاریئے وہ بھی اس طرح کہ آپ کو یقین ہوجائے کہ اس نے آپ کی آواز سن لی ہے اور جاگ گیا ہے، پھر چارپائی سے اترا کہ نہیں یہ اس پر چھوڑ دیجئے، اب اگر اس نے اٹھنے میں دیر کی اور اسکول پہنچنے میں لیٹ ہوا تو جلد ہی اسکول میں استاد کے رویہ اور اس کی نصیحتوں سے سیکھ لے گا کہ اسے کیا کرنا چاہیے، استاد کا اس سے بات کرنا زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت اس کے کہ آپ اس کو بار بار صبح پکارتے رہیں اور اس کے پیچھے لگے رہیں، لیکن اگر آپ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں تو پھر یاد رکھیے کہ جو کچھ آپ اختیار کریں گے اس کے نتائج بھی آپ کو اسی طرح سے جھیلنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آپ کے نوجوان بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ آپ اس سے اس طرح معاملہ کریں جیسے کسی بڑے اور ذمہ دار سے کیا جاتا ہے، لازمی سی بات ہے کہ پھر اس کو بھی بڑوں اور ذمہ داروں کا سا رویّہ اپنانا چاہیے اور ان ہی کے جیسا برتاؤ کرنا چاہیے اور اس کو اس طرح کی ذمہ داریاں اٹھانا چاہیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی ذمہ داری اٹھانا ہے، کس سے انکار کرنا ہے، کہاں غفلت برتنا ہے اور کہاں توجہ دینا ہے، یہ آپ کو ہی اپنے طرز عمل سے اس کو سکھانا پڑے گا جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل میں عرض کیا گیا۔

☆☆☆

❑ منصوبہ بندی

اسوۂ حسنہ کا ایک اہم پہلو

(مستقبل کے لیے افرادکار کی تیاری)

مولانا محمد سہیل ندوی

استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب ''رحمت عالم'' میں ایک بڑا بلیغ ومعنی خیز جملہ تحریر پر فرمایا ہے، ''سچ ہے قوم کی زندگی کی آگ نوجوانوں ہی کے جوش عمل کے ایندھن سے جلتی ہے''، یہ نہ صرف ایک جملہ ہے بلکہ طاقت وقوت سے لبریز ایک لافانی پیغام ہے، مسلّمہ اصول ہے کہ کسی بھی قوم کا مستقبل اس کے نوجوانوں سے وابستہ ہوتا ہے، نوجوانوں کی صلاح وفلاح میں معاشرہ وسماج بلکہ پورے پورے ملک کا مستقبل مضمر ہوتا ہے اگر وہ راہِ راست پر ہیں تو معاشرہ صحیح رُخ کا تعین کرے گا، سہی سمت کی طرف جائے گا اور اگر وہ ناکارہ وناقابل عمل، جوش وجذبہ سے عاری، اہداف ومقاصد سے خالی، تو پھر وہ معاشرہ وسماج، وہ قوم، دینی، فکری، تمدنی، تہذیبی، علمی الغرض ہر اعتبار سے زندگی کے ہر میدان میں پسماندہ وپچھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ انحطاط وتنزلی کی زندہ مثال بن کر رہ جاتی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں سید صاحب کے اس جملہ کی صداقت وحقانیت مزید دوچند ہوجاتی ہے، اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، آج جبکہ امت مسلمہ اور پورا عالم اسلام خصوصاً ہندوستان فرقہ پرستی، تعصب پرستی، اسلام دشمنی کی آگ میں جھلس رہا ہے، ملک خطرناک صورتحال سے گزر رہا ہے۔ نفرت وعداوت کی آگ میں جل رہا ہے، بے شمار مسائل درپیش ہیں، اس کے اسباب جو بھی ہوں یہاں ان کا شکوہ مقصود نہیں بلکہ شعور وآگہی وسیاسی بصیرت کے ساتھ ان کا حل اولین فریضہ ہے۔ سب سے پہلی ذمہ داری ہے، بلکہ وقت کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

آج ہندوستان کے جو حالات ہیں وہ کسی اہل بصیرت و دقت نظر سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہیں، آج کے خونچکاں حالات اور بدترین مظالم نے تقسیم ہند کی یاد تازہ کردی ہے۔ پر حالات دہلی کے ہوں یا لکھنؤ کے، یا انگریزوں کے دور سے لے کر دور آزادی تک، اور آزادی سے لے کر اب تک کم وبیش ستر، پچھتر سال کے اس عرصہ میں ہمارے بزرگوں ہی کی زبانی پچیس تیس ہزار فسادات ہوچکے ہیں، ان کو اگر شمار کرایا جائے تو ایک لمبی فہرست درکار ہوگی لیکن افسوس! امت نے ان واقعات سے سبق لینے کی کوشش نہیں کی، بیدار مغزی و کے ساتھ ایک لائحہ عمل طے کرنے اور اس کے مطابق سرگرم عمل وسنجیدہ ہونے کا تصور تو درکنار! ترقی یافتہ قوموں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ گردوپیش اور گزرے حالات سے سبق لیتی ہیں، اپنی ناکامیوں کے اسباب تلاش کرنے میں جٹ جاتی ہیں، وہ ان حالات کی روشنی میں ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی کرتی

ہیں، جبکہ اس کے برخلاف زوال یافتہ قومیں ناکامیوں در ناکامیوں کا منہ دیکھنے کے باوجود بھی کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں کرتیں، ان کی کوششیں ہنگامی حالات کے وقت محض وقتی اور دفاعی ہوتی ہیں، یہ زندہ قوموں کی علامت نہیں ہوسکتی، ملت کے ہر فرد کو اس بات کا اب اندازہ ہوجانا چاہیے، وقتی اور عارضی تدابیر سے اب مسئلہ حل نہیں ہونے والا ہے۔ضرورت ہے مستقل جدوجہد کی، مستقل مزاجی وثابت قدمی کی، اور اپنے حصہ کا بھرپور کام کرگزرنے کی، آپسی اختلاف وانتشار کو بالائے طاق رکھنے کی جو اس امت کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرتا چلا جارہا ہے، ضرورت ہے متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی، ہوشمندانہ قیادت کی، جو بصیرت کے ساتھ میدان عمل میں اتر کر ان مسائل کا حل پیش کرے، درد کا درماں بننے کی کوشش کرے، زمام قیادت کو اپنے منصوبہ بند عزائم اور دوراندیش فیصلوں سے تقویت پہنچائے، اس قوم کا مستقبل وہ جیالے ہوسکتے ہیں جو اپنے اندر پہاڑوں کی سی صلابت اور دریا جیسی روانی رکھتے ہوں، جو اپنے عزم سفر سے چٹانوں کو چور اور پہاڑوں کو زیر کرسکتے ہوں، لیکن آج کا المیہ یہ ہے نیا جوش و جذبہ رکھنے والوں، کم عمروں کو آگے بڑھانے، ان کی حوصلہ افزائی کرنے، ان کی رہنمائی کرنے کے بجائے ناتجربہ کار بتا کر ٹال دیا جاتا ہے، کم سنی وکم عمری کا بہانہ تراشا جاتا ہے چونکہ نیت میں کھوٹ ہے، پس پردہ گھٹیا خواہشات ہیں، خسیس اغراض ومقاصد ہیں، غلامانہ ذہنیت ہے، مفلوج دماغ ہیں، اسلام ایسی قدغن کو قبول نہیں کرتا بلکہ اسلام میں تقویٰ، صلاحیت وقابلیت، استعداد کی بنیاد پر ذمہ داریاں سپرد کی جاتی ہیں لیکن آج ان مسلمہ اسلامی و نبوی اصولوں سے انحراف کیا جارہا ہے، اغماض برتا جارہا ہے تو پھر کامیابی وکامرانی کس بنیاد پر اس امت کا استقبال کرے؟

لیاقت وصلاحیت، استعداد کی بنیاد پر ذمہ داریاں تفویض کرنے کا سب سے بڑا قدم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ آپؐ نے امت کو قیادت تیار کرنے کی تعلیم وتلقین کی اور یہ نکتہ سمجھایا کہ ہمیشہ بڑوں کی سرپرستی میں چھوٹوں کو آئندہ قیادت کے لیے تیار کرتے رہنا چاہیے، ان کو تجربات سکھاتے رہنا چاہیے، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیے تاکہ وقت پڑنے پر وہ کسی بھی اعتبار سے اپاہج، نابلد وناآشنا ثابت نہ ہوں بلکہ بڑوں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق بہ آسانی اگلے مراحل طے کرسکیں، آپ نے اپنے وصال سے چند دن پہلے حدود شام کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا جو تقریباً سات سو مجاہدین پر مشتمل تھا، اجلّہ صحابہ موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ، حضرت سعد اور سعید بن زید کے علاوہ اور بھی اکابر صحابہ موجود تھے جو سب کے سب جذبۂ شہادت سے سرشار تھے لیکن اس لشکر کی قیادت کے لیے آپؐ نے ۱۸/سالہ نوجوان حضرت اسامہ بن زید کو منتخب فرمایا، لوگوں کا اعتراض ہوا کہ بڑوں کی موجودگی میں ایک کمسن بچے کو قیادت کیوں سونپی جارہی ہے؟ آپؐ تک جب یہ اطلاع پہنچی تو آپؐ مرض کے باوجود حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لائے اور منبر پر رونق افروز ہوکر بڑا پرجلال خطبہ دیا، جس میں فرمایا تم لوگوں نے جو کچھ اس لشکر اور اس کی قیادت کے بارے میں کہا، مجھ تک وہ باتیں پہنچ چکی ہیں، یہ تمہارا کوئی نیا معاملہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے تم اس کے باپ کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکے ہو، اللہ کی قسم یہ دونوں مجھے محبوب ہیں اور قیادت کے لائق بھی، آپ کی تقریر کے اس انداز نے لوگوں کو حیران کردیا بے اختیار تمام صحابہ پکار اٹھے کہ آپؐ سے زیادہ صلاحیتوں کا استدراک کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اے اللہ کے رسولؐ ہم آپؐ کے فیصلے پر دل وجان سے راضی ہیں۔

فتح مکہ کے بعد جب کہ مکۃ المکرّمہ میں ایک سے بڑھ کر ایک صلاحیت کے مالک، صالح، متقی وپرہیزگار اور بااثر شخصیات واکابر صحابہ موجود تھے، اس وقت بھی رسول خدا نے

جوانی کے جوش جنوں اور نئے دماغ، نئے جذبہ کے حامل ایک انیس سالہ نوجوان صحابی حضرت عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ذمہ داری تفویض کرنے کے بعد آپ عتاب بن اسید کو مخاطب کر کے یوں گویا ہوئے، ''اے عتاب! تم جانتے ہو کہ میں نے تم کو کن لوگوں پر عامل بنایا ہے؟ اگر میں ان کے لیے تم سے بہتر کسی اور شخص کو سمجھتا تو اسی کو ان پر عامل بناتا، کیوں؟ کس بنیاد پر آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی؟ چونکہ آپ کو ان کی صلاحیتوں کا علم تھا، اور آپ سے زیادہ کون سا رہنما و حاکم اس بات کو جانتا ہوگا کہ قیادت کے لیے کن اوصاف و صفات سے متصف ہونا ضروری ہے، آپ دنیا کے سب سے بڑے قائد و منصف حکمراں تھے۔ آپ نے اپنی ریاست مدینہ کے ذریعہ اس کے عملی نمونے پیش کئے، عملی نمونے ایک دو نہیں عہد نبوی کے ہزاروں لاکھوں مسائل احادیث کے ذخیرہ میں محفوظ ہیں، ہمیشہ ہمیش کے لیے زندۂ جاوید ہیں، ان کے اندر ایک نمایاں خوبی اور تھی جس کی وجہ سے وہ رسول خدا کے چیدہ چنیدہ گوہر بن کر سامنے آئے، وہ اسلام کے لیے بڑے غیور تھے، حد درجہ غیرت تھی، دین میں مداہنت و مصلحت ذرہ برابر ان کو گوارہ نہیں تھی، دینی حمیت کا عنصر غالب تھا، دشمنان اسلام کے لیے بڑے سخت تھے، مومنوں کے لیے بڑے رحمدل تھے، نرم پہلو رکھنے والے تھے، یہی وہ صفات و خوبیاں تھیں جن کی بنیاد پر وہ آپؐ کے مرکز توجہ بنے، اور آپ کی نگاہ انتخاب ان پر ٹھہری، آپؐ کا ان پر بھروسہ کرنا مزید اعتماد کا سبب بنا، آپ نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے معاملات ان کے سپرد کر دیئے۔ جس سے مزید ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں، ان کے فیصلوں کو، ان کے طے کردہ امور کو لائق اعتنا سمجھا، بچکانہ حرکت پر محمول نہیں کیا، ناسمجھی کی باتیں کہہ کر ٹال نہیں دیا، بلکہ ان کے تعلق سے بڑے بلند کلمات کہے۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی عہدے پر برقرار رکھا اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا، یہ ان کے لیے سب سے اعلیٰ سند کی بات ہے اور صرف یہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ مختلف ایسے واقعات ہیں جن میں آپ نے نوجوان دل و دماغ رکھنے والے افراد کو آگے بڑھایا، ان کو تجربات سکھائے خواہ حضرت جبیر بن مطعم ہوں، اسامہ بن زید ہوں، عمیر بن العاص ہوں، معاذ بن جبل ہوں یا حضرت ابن عباس بلکہ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے حضرت عمر سے کہا بھی کہ آپ ایک ناسمجھ اور کمسن نوجوان کو ہمارے ساتھ مجلس میں شریک کرتے ہیں ان جیسے تو ہمارے بچے ہیں، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''ابن عباس کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ ان کے علم، ان کی صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر ہے نہ کہ عمر کی بنیاد پر''، چونکہ جوانی کا مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے، اس عمر میں جو کام انجام دیئے جاسکتے ہیں زندگی کے کسی مرحلہ میں نہیں دیے جاسکتے، جب جسم جوان ہوتا ہے تو دماغی صلاحیتیں بھی جوان ہوتی ہیں، پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ کام کرنا آسان ہوتا ہے، اسی لیے آپؐ نے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی حتی المقدور کوشش کی اور عہد نبوی میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ آپ نے لوگوں کے مجمع سے نوجوان صلاحیتوں کو ترجیح دینے کی کوشش کی اور ان کو اول مقام پر رکھا، کیا آج ہمارے لیے یہ اسوۂ رسولؐ کافی نہیں ہے؟ لیکن کیا کیا جائے جمود و تعطل کی بیڑیوں نے جکڑ رکھا ہے، حکمتوں نے شکنجہ کس رکھا ہے، مصلحت کے دبیز پردے ہیں، ضرورت ہے ان پردوں کو چاک کر کے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کی، نظم و نسق کے ساتھ قیادت کو قوت فراہم کرنے کی، ورنہ امت کے مسائل موروثیت و رسمیت سے حل ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے، بلکہ مزید الجھتے چلے جائیں گے، کیونکہ فیصلۂ الٰہی ہے، إن اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسهم۔ خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات کے بدلنے کی کوشش نہ کرے۔

☆☆☆

❑ مطالعات

مولانا حفظ الرحمٰن اور سیرت رسول کریم ﷺ

محمد ساجد
ریسرچ اسکالر، شعبۂ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Email Id: mohdsjd1@gmail.com

آپ کا نام معزالدین بن شمس الدین صدیقی تھا۔ حفظ الرحمٰن آپ کا تاریخی نام ہے جبکہ اس کو رحمان کے الف کے ساتھ لکھا جائے اور کنیت ابوالقاسم ہے۔لیکن تمام تر تحریروں اور خطوط کے اختتام پر جو آپ نے مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم عمومی علماء ہند، مسٹر محمد علی جناح قائد اعظم آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر حکام کو ارسال فرمائے تھے، آپ کے جو دستخط ملتے ہیں اس پر آپ بحیثیت خادم ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن لکھتے ہیں۔[۱]

آپ کی ولادت ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۰ / جنوری ۱۹۰۱ء ،قصبہ سیوہارہ کے ایک تعلیم یافتہ زمیندار صدیقی گھرانے میں ہوئی۔[۲]

مولانا حفظ الرحمٰن نے ابتدائی مکتبی تعلیم اپنے گھر پر والد ماجد مولوی شمس الدین سے حاصل کی۔آپ کے والد ماجد نے آپ کی ذہانت وذکاوت کو دیکھ کر عربی تعلیم دلانے کا ارادہ کیا۔اس کے بعد آپ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد سے ہوا جہاں انھوں نے چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو ۱۶ / صفر ۱۳۳۳ھ میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل کر دیا گیا، جس میں انھوں نے شرح جامی، شرح وقایہ، نورالانوار جیسی کتابیں پڑھیں۔[۳]

مدرسہ شاہی مرادآباد سے فارغ ہونے کے بعد مولا حفظ الرحمٰن کو مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں درس نظامی کی تکمیل تک آپ مصروف تعلیم رہے۔

مولانا ۱۳۴۱ھ، بمطابق ۱۹۲۲ء میں مدرسہ فیض عام سیوہارہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مزید علوم وفنون کی تکمیل کے لیے ایشیاء کی مشہور علمی درس گاہ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند پہنچے اور دورۂ حدیث میں داخلہ لیا۔[۴]

فراغت کے بعد اکابر دیوبند نے مولانا حفظ الرحمٰن کی قابلیت کو دیکھ کر آپ کو دارالعلوم دیوبند میں معین المدرس کی خدمات سپرد فرمائیں۔آپ نے بہت جلد اکابر اساتذہ کرام اور طلبہ کی نظروں میں محبوبیت ومقبولیت پیدا کر کے ایک بلند مقام حاصل کیا۔

برنام بٹ مدراس سے جب ایک امتیازی اوصاف رکھنے والے عالم دین کی درخواست آئی، تو اکابر دارالعلوم دیوبند نے مولانا حفظ الرحمٰن کا انتخاب فرمایا، آپ

اساتذہ کرام کے حکم سے برنام بٹ مدراس تشریف لے گئے اور اپنی انتھک محنت اور بے پناہ قابلیت کے جوہر سے وہاں کے لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا، یہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا اور دو کتابچے ''حفظ الرحمٰن لمذاہب النعمان'' اور ''مالابار میں اسلام'' تصنیف فرمائے۔۵

کچھ دنوں تک دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ امروہہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۲۸ء میں جب دارالعلوم دیوبند میں اصلاحی تحریک نے قوت اختیار کی جس سے پیدا شدہ اختلافات کی بنا پر علامہ انور شاہ کشمیری، شبیر احمد عثمانی جیسے اساتذہ کرام نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے جہاں انھوں نے مدرسہ جامعہ اسلامیہ میں تقریباً پانچ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ کی درخواست پر جس کے سرپرست امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے، آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ جہاں ڈھائی سالہ قیام کے دوران مولانا حفظ الرحمٰن نے پوری تندہی کے ساتھ درس قرآن کی خدمات انجام دیں۔۶

کلکتہ سے واپسی پر جب ایک مستقل ادارے کے قیام کی بات لوگوں کے مشورے سے سامنے آئی تو آپ نے اپنے دیرینہ رفیق مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ مل کر ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد رکھی جس کے نگراں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے ندوہ المصنّفین میں بڑی گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں۔قصص القرآن (چار جلدیں)، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، اسلام کا اقتصادی نظام جیسی بیش بہا کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں۔اس سے پہلے ۱۹۳۲ء میں آپ دہلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں سیرت نبویؐ پر رسول کریم اور بلاغ مبین جیسی کتابیں تصنیف فرما چکے تھے۔۷

سیرت رسول کریم ﷺ:

۱۹۳۵ء میں ''نورالبصر فی سیرۃ خیرالبشر المعروف سیرت رسول کریمؐ'' جس کو مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے اصرار پر مجاہد ملت حفظ الرحمٰن نے مدارس عربیہ اور مدارس قومیہ کے متوسط طلبہ کے علاوہ سیرت سے شغف رکھنے والے مرد اور عورتوں کے لیے تالیف فرمائی۔۸

پہلے ہی ایڈیشن کو اپنے استاذ محترم کی خدمت میں پیش کیا۔اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے استاذ کی رائے بھی حاصل کرنی چاہی جس پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا:

''نورالبصر فی سیرۃ خیر البشر'' مولفہ جناب مستطاب مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی دام عزہ احقر کے اصرار پر تالیف ہوئی ہے۔احقر کا خیال تھا کہ کوئی متوسط سیرت ایسی تالیف ہو کہ مدارس عربیہ اور مدارس قومیہ کے طلبہ اس سے بہ سہولت مستفید ہوسکیں اور حدیث شریف کے مشتغلین کو اجمالی بصیرت نصیب ہو اور کتب معتبرہ سے ماخوذ ہو اور اہل حق اور سلف کے طریقے کے خلاف نہ ہو۔ بحمداللہ یہ مختصر کتاب ایسی ہی واقع ہوئی ہے حق تعالیٰ مولف کو جزائے خیر نصیب کرے اور ان کی یہ خدمت بارگاہ نبوت میں قبول ہو۔آمین!۔''۱۱

اس کتاب کا نام سلف کے طرز پر ''نورالبصر فی سیرۃ خیرالبشر'' رکھا مگر کتاب کے ٹائٹل پر مختصر نام ''سیرۃ رسول کریم'' لکھا گیا ہے۔نورالبصر فی سیرۃ خیرالبشر المعروف سیرت رسول کریم کا پہلا ایڈیشن ''مجلس علمی ڈابھیل'' نے طبع

کرایا جس پر مولانا محمد انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی نے تقریظ فرمائی، یہ کتاب ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی اپنی تقریظ میں فرماتے ہیں کہ:

''میں نے رسالہ نور البصر فی سیرۃ خیر البشر المعروف سیرۃ رسول کریم کو مختلف مقامات سے دیکھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے حالات جس اختصار اور تہذیب کے ساتھ صحت مضامین کا خیال رکھتے ہوئے قلم بند کیے گئے ہیں ان کی بنا پر اگر اس رسالہ کو عدیم النظیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ رسالہ مذکورہ میں جناب مؤلف نے طلبہ کی آسانی سے استفادہ اور حفظ کے لیے جو بدیع اسالیب اختیار فرمائے ہیں، انھوں نے اور چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ رسالہ ضرور اس قابل ہے کہ اس کو مسلمانوں کی تعلیم گاہوں میں اوسط درجہ کے طلبہ کے لیے منتخب کیا جائے۔''[۱۰]

مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی کتاب سیرت رسول کریم میں دورِ جدید کے احساسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند قابل امور کو خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے جو درجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اکثر عنوانات کے حسب حال قرآن عزیز کی آیات یا احادیث نبوی ﷺ کو زیر عنوان نقل کیا ہے تاکہ ایک مسلمان، سیرت کے مضامین کی اہمیت اور انکے اشتہادات کی کیفیت کا اندازہ کر سکے اور مسلم طلبہ کے قلوب میں زمانہ طالب علمی ہی سے قرآن عزیز واحادیث کے مطالب سمجھنے کا ذوق سلیم پیدا ہو۔

۲۔ ہر ایک مضمون کے بعد اس کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات لکھے ہیں۔ اس سے طلبہ کو جو فائدہ ہوتا ہے، وہ تو ایک بدیہی بات ہے۔ لیکن طلبہ کے علاوہ سیرت سے شغف رکھنے والے حضرات کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اس مضمون کا خلاصہ ذہن نشین کر سکیں گے اور مضمون سے پیدا شدہ سوالات کا مطالعہ اصل حالات کے صحت وسقم کی طرف خود رہنمائی کرے گا۔

۳ سیرت کے متعلق معرکۃ الآرا مسائل میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے تاکہ مسلمان اپنے پیغمبر کی سیرت سے متعلق ان اعتراضات کے دور کرنے پر قادر ہوں، جو حق ناشناس اور متعصب غیر مسلموں کی جانب سے آئے دن کیے جاتے ہیں۔ اسلوب بیان میں صرف مختصر تحقیق ہی کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ مناظرانہ رنگ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ تاکہ سیرت کی کتاب مناظرہ کی کتاب نہ بن جائے اور اگر غیر مسلم بھی اس کا مطالعہ کریں تو حق شناس نظریں اس سے متاثر ہوں۔

۴۔ شروع میں مقدمہ تاریخ ہے جو اس سلسلہ میں سودمند ہے اور مطالعہ تاریخ کا ذوق پیدا کرتا ہے۔

۵۔ عام کتب سیرت کی طرح اس مجموعہ میں یہ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ تمام واقعات سنہ وار ترتیب سے بیان کیے جائیں بلکہ ہجرت سے قبل اور ہجرت سے بعد کے اکثر واقعات کو مسلسل بیان کیا ہے۔ تاکہ باہمی مضامین ایک رشتہ میں مربوط رہیں۔ اور یاد کرنے میں ممد ومعاون ہوں اور اس کے بعد بقیہ مضامین کو حسب ضرورت سن وار بیان کیا ہے۔

۶۔ اس مختصر سیرت کا نام سلف کے طرف پر ''نور البصر فی سیرۃ خیر البشر'' ہے مگر ٹائٹل پر مختصر نام ''سیرت رسول کریم'' لکھا گیا ہے۔[۱۱]

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب سیرت رسول کریم کے مقدمہ میں تاریخ، تاریخ کے مآخذ، تاریخ کس طرح وجود میں آتی ہے، سیرت اور سیرت کا فائدہ

جیسے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔آپ مقدمہ کے خلاصے میں لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ علم طبیعی ہے جس سے اشخاص واقوام کے موجودہ وگذشتہ حالات معلوم ہوتے ہیں اور مفید ہے۔تاریخ آثار ورسوم سے بنتی ہے۔ تاریخ کو علم جغرافیہ وتقویم (جنتری) سے مدد ملتی ہے۔مبدا تاریخ اہم واقعات وحوادث بنتے ہیں جیسے میلاد مسیح (علیہ الاسلام) یا ہجرت محمدیہ ﷺ ابتداء آفرینش انسان کا صحیح اور تحقیقی زمانہ غیر معلوم ہے۔متوسط رائے کی بنا پر تقریباً سات ہزار سال تخمینہ کیا جاتا ہے، تاریخ عام اور خاص زمانہ تاریخ تین ہیں، قرون اولیٰ، قرون متوسط اور قرون متاخرہ، زمین شروع میں آگ کا کرہ تھی مدت کے بعد سرد اور سخت ہوکر حیوانات اور نسل انسانی کی حیات کے قابل ہوئی۔انسان ابتداء حیات میں غیر متمدن تھا اور اس کے تدریجاً موجودہ تمدن اختیار کیا۔تاریخ انسانی کا منضبط پتہ تقریباً چار ہزار سال سے چلتا ہے۔''[۱۲]

آپ نے اپنی اس کتاب سیرت رسول کریم میں اسلام سے قبل عرب کے حالات، آپ ﷺ کی ولادت باسعادت، آپ ﷺ کے مکی، مدنی حالات زندگی کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔کتاب میں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ آپ نے ہر عنوان کے بعد اس کا خلاصہ اور اس سے متعلق سوالات پیش کیے ہیں۔

حوالے وحواشی

۱۔مجاہد ملت نمبر، روزنامہ الجمعیۃ، دہلی، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۹

۲۔نظام الدین قاسمی، مولانا، تذکرہ اکابر، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوبار، مہاراشٹر، طبع ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۲

۳۔سلمان منصور پوری، محمد، تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، مرکز نشر وتحقیق، لال باغ، مرادآباد، طبع رجب المرجب ۱۴۲۳ھ، ص ۲۱۲

۴۔سلمان منصور پوری، محمد تاریخ شاہی نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۴۶

۵۔محبوب رضوی، سید، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مکتبہ دارالعلوم دیوبند (یوپی) طبع ۲۰۱۴ء جلد دوم، ص ۱۴۸

۶۔مجاہد ملت نمبر، روزنامہ الجمعیۃ، دہلی، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۱

۷۔محبوب رضوی، سید، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مکتبہ دارالعلوم دیوبند (یوپی) طبع ۲۰۱۴ء جلد دوم، ص ۱۴۸۔۱۴۹

۸۔انور محمود، ڈاکٹر، اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ، مطبع حیات اسلام پریس ریلوے روڈ لاہور، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۶۷۰

۹۔حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا، سیرت رسول کریم ﷺ مکتبہ ڈکن ٹریڈرس حیدرآباد، طبع جون ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

۱۰۔ایضاً، ص ۱۳

۱۱۔ایضاً، ص ۱۹

۱۲۔ایضاً، ص ۶۶۔۶۷

☆☆☆

❑ تحریکِ عمل

چار اہم سوال؟

مولانا سید احمد ومیض ندوی
(استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد)
email: awameez@gmail.com

گذشتہ دنوں احقر جنوبی ہند کی ایک مؤقر جامعہ سے شائع ہونے والے مجلّہ کے خصوصی شمارے پر طائرانہ نظر ڈال رہا تھا کہ ایک مختصر سے ڈبے میں دئے گئے مذکورہ بالا عنوان ''چار اہم سوال'' پر نگاہ ٹھہری، عنوان کے تحت دیا گیا اقتباس کچھ یوں تھا ''۱۹۹۵ء کی بات ہے، قاہرہ میں ایک مجلس میں فیصل ایوارڈ یافتہ حضرات کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا، ان میں بوسینا کے صدر علی عزت بیگوچ بھی تھے، انہوں نے اپنے مقالے کے اخیر میں کہا کہ میرے ذہن میں چار سوال ہیں میں چاہتا ہوں کہ جو ان کا تسلی بخش جواب دے اسے خدمتِ اسلام کا فیصل ایوارڈ ملے:

(۱) پہلا سوال یہ کہ امت مسلمہ جسے اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی میں "اقرأ" (پڑھ) کا درس دیا ہے اس وحی کو نازل ہوئے آج تقریباً چودہ سو سال ہو رہے ہیں اس کے باوجود اس امت کی اکثریت ناخواندگی کا شکار کیوں ہے؟؟

(۲) دوسرا سوال یہ کہ اسلام میں وقت کی پابندی پر زور دیا گیا ہے، مثلاً: نماز کا وقت مقرر ہے روزے کا مہینہ مقرر ہے، زکوٰۃ کا وقت مقرر ہے، حج کی تاریخ مقرر ہے، لیکن دنیا میں سب سے زیادہ وقت کا ضیاع مسلمان کرتے ہیں کیوں؟ وقت کی پابندی کے تئیں ان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ چند سال پہلے ''رباط'' میں تنظیم اسلامی (OIC) کی ایک چوٹی کانفرنس ہوئی جس میں مسلم ممالک کے بادشاہ صدور وغیرہ شریک تھے، یہ کانفرنس ۹ گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی۔

(۳) تیسرا سوال یہ کہ اسلام نے طہارت ونظافت کو نصف ایمان قرار دیا ہے، اس کی ہر عبادت طہارت اور صفائی ستھرائی سے وابستہ ہے، مگر کیا بات ہے کہ مجموعی طور پر مسلمان صفائی ستھرائی کے معاملے میں سب سے پیچھے ہیں؟

(۴) آخری سوال یہ کہ اسلام میں توحید کے بعد اتحاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر کیا وجہ ہے کہ امت مسلمہ سب سے زیادہ اختلاف وانتشار کا شکار ہے؟؟ (راہ اعتدال ستمبر ۲۰۰۷)

علی عزت بیگوچ ایک صاحب بصیرت دانشور ایک عظیم مسلم قائد گذرے ہیں، عالمی حالات سے گہری واقفیت کے ساتھ قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے، انہیں ان کی اسلامی خدمات پر شاہ فیصل

ایوارڈ سے نوازا گیا تھا، بوسینا کے سابق صدر علی عزت بیگوچ نے جن چار سوالوں کو اٹھایا ہے وہ فی الواقع اہمیت کے حامل ہیں، انہوں نے اپنے ان سوالات میں مسلمانوں کے تعلق سے جن چار مسائل کا تذکرہ کیا ہے ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تعلیمی پسماندگی ہی کو لیجئے آج ہر جگہ مسلمانوں کی پہچان بن گئی ہے، غیر مسلم معاشروں میں مسلمان ایک ناخواندہ ان پڑھ قوم کی حیثیت سے متعارف ہیں، جب کہ مسلمانوں کو سب سے پہلا جو سبق دیا گیا وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے، مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی واحد مذہب ہے جو پڑھنے اور حصول علم کو عبادت کا درجہ دیتا ہے، قرآن وحدیث میں اگر چہ علم کا حقیقی مصداق معرفتِ الٰہی تک پہونچانے والا علم ہے لیکن علم نافع اور تسخیر کائنات والے علم کے تعلق سے بھی بار بار ترغیب دی گئی ہے، سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم الاسماء عطا فرمایا پھر انہیں خلافتِ ارضی کا اہل قرار دیا گیا، نیز علم کے ذریعہ فرشتوں پر فوقیت عطا کر کے انہیں مسجود ملائکہ بنایا گیا، پہلی وحی میں قراءت، علم، تعلیم اور قلم جیسے الفاظ کو لا کر علم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، غزوہ بدر کے موقع پر کافر قیدیوں کی رہائی کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ ان میں جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں وہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے جس امت کو علم واخلاق کی بنیادوں پر کھڑا کیا تھا آج وہ امت تعلیم سے کوسوں دور ہے۔ ملکی سطح پر مسلمان تعلیم میں پسماندہ ہیں اور عالمی سطح پر بھی، ابھی گذشتہ دنوں سول سروسیز امتحانات کے نتائج کا اعلان کیا گیا، ملک بھر میں جملہ ۱۱۲۲ کامیاب امیدواروں میں صرف ۳۴ مسلمان کامیاب ہوسکے، ٹاپ ۱۰۰ میں صرف ۴ مسلمانوں نے جگہ پائی، پچھلے ۵ سالوں کے نتائج کا جائزہ لیا جائے تو مسلم امیدواروں کی کامیابی کا فیصد دو سے چار کے درمیان میں رہا، یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ان امتحانات میں کامیاب ہونے والے امیدوار ہی ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوتے ہیں، عملا ملک کا نظام وہی چلاتے ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق صرف ۳۰ فیصد مسلم بچے ہی اسکولی تعلیم سے وابستہ ہیں، بقیہ ۷۰ فیصد کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسکول کس چڑیا کا نام ہے، پھر جو بچے اسکول جاتے ہیں ان میں ایک بڑی تعداد درمیان میں ترک تعلیم کر دیتی ہے، گذشتہ دنوں دہلی کے مرکز برائے مطالعہ امن (CPS) نے ایک رپورٹ منظر عام پر لائی، اس سروے میں ملک کی ۱۵ ریاستوں کا احاطہ کیا گیا اور ۸ ہزار سے زیادہ لوگوں سے سوالات کئے گئے، رپورٹ میں ۲۵۰۰ مسلم بچوں کا جائزہ لیا گیا جنہیں کبھی اسکول جانا نصیب نہیں ہوا اس پر طرہ یہ کہ ۱۷۰۰ بچے ایسے ہیں جنہیں اسکول میں داخل کروایا گیا تھا لیکن پہلے ہی سال اسکول سے نکل گئے، رپورٹ کے مطابق بہار میں جن بچوں کو اسکول میں شریک کروایا جاتا ہے ان میں سے صرف چار فیصد بچے ہی یونیفارم کے متحمل ہوسکتے ہیں، ۷ فیصد بچے ہی کتابیں خرید سکتے ہیں، ۵۶ فیصد بچوں کو کھانا میسر آتا ہے، گجرات میں حالت مزید ابتر ہے جہاں ۳ مسلم بچوں میں سے صرف ایک کے پاس اسکول یونیفارم ہوتا ہے اور ایک تہائی بچوں کو دوپہر کا کھانا نہیں ملتا، گورنمنٹ اردو پرائمری اسکولوں کی حالت زار تو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، شہر بنگلور میں تعلیمی شعبہ سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے عہدیدار نے اپنے ساتھ پیش آئے واقعہ کو لکھتا ہے: ''ایک صبح کو نو بجے میں اپنے دفتر کے لئے محلے کے ایک گورنمنٹ اردو پرائمری اسکول کے پاس سے گذر رہا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ بچے خوش کے مارے ناچتے تالیاں بجاتے چیخ وپکار کرتے ہوئے اسکول سے نکل رہے ہیں اس منظر کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا، وجہ پوچھی تو بچوں نے کہا آج

ہمارے حضرت کے رشتہ دار کی شادی ہے اس لئے اسکول کی چھٹی ہے۔ وہ اپنا ایک اور مشاہدہ یوں بیان کرتے ہیں ''دوپہر کے کوئی ڈھائی بجے ہماری ٹیم شہر کے ایک اور اسکول پہونچی وہاں دیکھا کہ بچوں کے شوروغل کی وجہ سے کان میں آواز سنائی نہیں دے رہی ہے، آگے بڑھنے پر لگا کہ جیسے بند کمرے کے اندر بچے آپس میں مار پیٹ کررہے ہیں، جونہی کسی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس شوروغل میں استانی صاحبہ بینچ پر خراٹے مارتے ہوئے سورہی تھیں اور بچے تاش کھیلنے میں مصروف ایک دوسرے پر جھپٹے پڑ رہے تھے، ہم پر نظر پڑتے ہی لائق شاگردوں نے استانی صاحبہ کو جگایا تو محترمہ بڑبڑا کر اٹھیں، نیند میں ڈوبی آنکھوں کو مسلسل مسلتے مسلتے ایک عجیب سی کیفیت میں بولیں، دراصل سر میں درد ہونے کی وجہ سے تھوڑا سا لیٹ گئی تھی، تعلیم کے تعلق سے بڑھتی بے اعتنائی امت مسلمہ کے لئے فالِ نیک نہیں، اس کے لئے ملت کے باشعور طبقہ کو پوری قوت کے ساتھ تعلیمی بیداری کی مہم چلانی ہوگی۔

یہ تو ملکی سطح پر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا جائزہ تھا۔ عالمی سطح پر بھی مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہیں، ابھی گذشتہ دنوں دنیا کی ۱۰۰ شہرت یافتہ یونیورسٹیوں کی عالمی درجہ بندی کی رپورٹ منظر عام پر آئی، اس سال کی گئی درجہ بندی میں دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ۸ امریکی یونیورسٹیوں نے ٹاپ ۱۰ میں جگہ حاصل کی، ہارورڈ یونیورسٹی دنیا کی سوشہرت یافتہ جامعات میں سرِفہرست ہے ان سو یونیورسٹیوں میں مسلم ممالک کی کوئی ایک یونیورسٹی بھی شامل نہیں ہے، بیشتر سے مسلم ممالک میں تعلیمی شرح قابل اطمینان نہیں ہے، اس کے برخلاف ہمارے دشمن یہودی تعلیم اور سائنس وٹیکنالوجی میں ہم سے آگے ہیں، ۱۰۵ سالوں میں یہودیوں نے ۱۸۰ نوبل انعام حاصل کیا ہے جب کہ مسلمان صرف ۳ انعام حاصل کرسکے حالانکہ آبادی کے لحاظ سے ایک یہودی سو مسلمانوں کے مقابل ہے، کچھ عرصہ قبل امریکی یہودیوں نے ایک ملین ڈالر چندہ اکٹھا کر کے اپنے روحانی پیشوا کے پاس اسرائیل بھیجا، جنہیں چیف ربی کہا جاتا ہے اور کہا گیا کہ اس رقم سے ایک عالی شان عبادت گھر تعمیر کیا جائے، چیف ربی نے کہا ہم کون ہوتے ہیں اس حقیر رقم سے اس عظیم پروردگا کے لئے محل تعمیر کرنے والے، اس کی عبادت تو کہیں بھی کی جاسکتی ہے، لیکن اسے پہنچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے اس لئے اس رقم سے پہلے ایک تعلیمی اکیڈمی قائم کرو تا کہ کوئی بھی یہودی بے علم نہ رہ سکے۔

دوسرے سوال میں اٹھایا گیا مسئلہ بھی اس وقت مسلمانوں کا طرہ امتیاز بن گیا ہے جبکہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے جن سنہرے ادوار میں جو کچھ کامیابی حاصل کی تھی وہ وقت کی قدر دانی ہی سے حاصل کی تھی، عہد عباسی میں مسلمانوں نے جو سائنسی ترقی کی تھی وہ وقت کے صحیح استعمال کا نتیجہ تھا، پھر بعد کے زمانوں نے قوم مسلم کا زوال وقت کی ناقدری ہی کے سبب ہوا، موجودہ دور میں مسلم نوجوان وقت کا کس بے دردی کے ساتھ قتل کرتے ہیں اس کا اندازہ کرنا ہو تو مسلم محلوں کا دورہ کیجئے، ہر جگہ چبوتروں پر مسلم مسلم نوجوانوں کی بھیڑ نظر آئے گی جو گپ شب میں گھنٹوں ضائع کرتے ہیں، شادی خانوں اور دعوتی پروگراموں میں کھانے کے انتظار میں گھنٹوں گذر جاتے ہیں، رقعوں میں بعد نماز عشاء تحریر ہوتا ہے جبکہ دولہا پہونچنے تک بسا اوقات گیارہ بارہ بج جاتے ہیں، ہمارے مذہبی جلسوں کا حال بھی کچھ کم ابتر نہیں، اکثر جلسے وقت پر شروع نہیں ہوتے، جلسوں کے منتظمین وقت پر شروع کرنا بھی چاہیں تو سامعین کی تاخیر سے حاضری

رکاوٹ بنتی ہے، یہ اس قوم کا حال ہے جس کے مذہب میں سب سے زیادہ وقت کی قدردانی پر زور دیا گیا ہے، قرآن مجید میں زمانہ کی قسم کھا کر وقت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، اس سے ہٹ کر کہیں فجر کے وقت کی قسم کھائی گئی تو کہیں چاشت کے وقت کی کہیں رات و دن کی قسم کھائی گئی، قیامت کے دن ہر انسان سے جو پانچ سوال کئے جائیں گے ان میں سب سے پہلا سوال عمر کے بارے میں ہوگا کہ اسے کس کاموں میں صرف کیا، نبی رحمت ﷺ نے وقت کی قدر دانی کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، موت سے پہلے زندگی کو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، فقر سے پہلے بے نیازی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، اور مشغولیت سے پہلے فراغت کو نیز آپ نے فرمایا، اللہ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگ دھوکہ میں رہتے ہیں، ایک صحت اور دوسرے فراغت، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے جس نے اپنی عمر کا کوئی دن اس کا حق ادا کئے بغیر گذارا یا کوئی فرض ادا نہیں کیا یا عزت کا کوئی کام نہیں کیا یا قابل تعریف کوئی عمل نہیں کیا یا کسی چیز کی بنیاد نہیں ڈالا یا کوئی علم حاصل نہیں کیا تو اس نے اس دن کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے اوپر ظلم کیا، علامہ ابن قیم کا قول ہے کہ وقت کا ضیاع موت سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وقت کا ضیاع تم کو اللہ اور اخروی زندگی سے دور کرتا ہے اور موت تم کو دنیا اور دنیا والوں سے دور کرتی ہے، بقول علامہ یوسف القرضاوی کے جو اپنا وقت برباد کرتا ہے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے یہ سلو پوائزن خودکشی ہے جس کا ارتکاب وہ لوگوں کے سامنے کرتا ہے لیکن اس کو کوئی سزا نہیں دیتا، جو لوگ وقت کی ناقدری کرتے ہیں وہ دراصل اپنے اونچے نصب العین سے غافل ہیں، امت مسلمہ کے ہر فرد کو اللہ نے جس مقصد کے لئے برپا کیا ہے، اس کا ادراک ہوجائے تو اسے موجودہ زندگی بہت ناکافی معلوم ہونے لگے، ہماری ذمہ داریاں ہمیں حاصل زندگی سے زیادہ ہیں، مختصر زندگی میں ہمیں اپنی عظیم ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے، تاریخ اسلام کے سارے مصلحین اور عبقری شخصیتوں نے ایک لمحہ کے ضیاع کو گوارا نہیں کیا، اس کے لئے عوام میں بیداری شعور کی مہم چلائی جائے ہم اپنی تقریبات اور پروگراموں میں وقت کی پابندی کا ضروری خیال کریں، ہم اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے وقت کی قدر دارنی کی تعلیم دیں، ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر کریں اور اسی وقت میں اسے انجام دیں، صبح بیدار ہونے سے لے کر رات سونے تک ہمارے اوقات منضبط ہونے چاہئے، آج کے کام کو کل پر ٹالنا چھوڑ دیں، ملازمت کے اوقات کا بھرپور خیال رکھیں، رات عشاء کے بعد کوئی خاص دینی یا دنیوی مصروفیت نہ ہو تو جلد سونے کا اہتمام کریں، گھروں سے ٹی وی کلچر کا خاتمہ کریں، ٹی وی ہماری بربادی کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ہے، رات ۱۲ ایک بجے تک ٹی وی بینی میں ہم اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں، رات کے وقت کا ضیاع ہمیں صبح بیداری میں رکاوٹ بنتا ہے، جس کی وجہ سے فجر کی نماز ضائع ہوجاتی ہے، ہم اپنے آفسوں اور ملازمت گاہوں میں وقت کی پابندی کو شعار بنائیں، اوقات کی قدردانی کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی رفاہی خدمات اور سوشیل ورک میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے تاکہ اس کا کوئی وقت فارغ نہ رہے۔

تیسرا سوال نظافت اور صفائی سے متعلق ہے، یہ بات فی الواقع حیرت انگیز ہے کہ سب سے زیادہ نظافت پر زور دینے والا مذہب اسلام ہے، اور نظافت سے سب سے دور قوم، قوم مسلم ہے، ایک نماز ہی کو لیجئے اس کی درستگی کے لئے بدن کا پاک ہونا ضروری ہے، کپڑوں کا پاک ہونا

ضروری ہے، پھر جس جگہ نماز ادا کی جائے اس کا پاک ہونا ضروری ہے، وضو کے بغیر نماز ممکن نہیں، ایک مسلمان کو دن میں پانچ مرتبہ اعضائے وضو کو دھونا پڑتا ہے، اتنا ہی نہیں راستہ کو صاف رکھنا ایمان کا شعبہ قرار دیا گیا، ارشاد نبوی ہے: ایمان کے ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، اعلیٰ شاخ لا الہ الا اللہ کا اقرار اور ادنی شاخ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا، (الجامع الصغیر: ۲۸۰۰) قرآن میں کپڑوں کی صفائی سے متعلق فرمایا گیا: وثیابك فطهر اور اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھو اتنا ہی نہیں گھروں کے صحنوں سے متعلق حکم دیا گیا کہ انہیں صاف رکھا جائے، الطهور شطر الایمان کہہ کر طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا، نبی ﷺ کے زمانہ میں کسی نے مسجد کی دیوار پر تھوک دیا تھا نبی کریم ﷺ کو بے حد ناگوار گذرا، آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اس گندگی کو صاف کیا اور اس کہ جگہ خوشبو لگادی، (سنن ابوداؤد: ۴۷۹) اسلام میں نظافت کی اس قدر اہمیت کے باوجود ہم اس تعلق سے انتہائی کوتاہ واقع ہوئے ہیں، شہروں میں مسلم بستیوں اور محلوں میں جایئے صاف محسوس ہوگا کہ یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے، جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کا انبار لگا رہے گا، گھروں میں صفائی نام کی چیز نہ ہوگی، عیدالاضحیٰ کے موقع پر سڑکوں اور گلیوں کو جانوروں کی غلاظت سے ایسے آلودہ کیا جاتا ہے کہ ہفتوں تک اس کے اثرات سے چھٹکارا ممکن نہیں، گندگی اور نظافت سے دوری ہماری پہچان بن گئی ہے، ایک عالم دین نے لکھا ہے کہ چند احباب ایک دینی ادارے کی زیارت کے ارادے سے ایک شہر گئے انہیں اس ادارے کا پتہ معلوم نہیں تھا، پتہ کی تلاش میں وہ جس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے وہ صاف ستھری تھی کسی سے انہوں نے پوچھا تو جواب ملا: آپ دائیں جایئے اور سیدھ میں چلے جایئے، جہاں سے گندگیاں نظر آئیں سمجھئے کہ مسلمانوں کا علاقہ شروع ہوا، اس سے گذرتے جایئے جس جگہ گندگیوں اور کوڑا کرکٹ کا انبار نظر آئے رک جایئے وہیں آپ کو اس ادارے کا سائن بورڈ نظر آئے گا، احباب نے ویسا ہی پایا، اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے ہمیں عام مسلمانوں میں نظافت کے تعلق سے باقاعدہ بیداری مہم چلانی ہوگی۔

چوتھا اور آخری سوال مسلمانوں کے آپسی انتشار سے متعلق ہے، ہماری ہر عبادت ہمیں اجتماعیت کا درس دیتی ہے، ہمارا دین ہمیں قدم قدم پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح رہنے کی تلقین کرتا ہے، نزاع اور تفرقہ سے بچنے کی تاکید قرآن میں بار بار آئی ہے، ہمارا انتشار پوری دنیا میں ضرب المثل بن چکا ہے، موجودہ حالات ہی کا جائزہ لیجئے مسلمانوں کے انتشار کا اندازہ ہوجائے گا، مسلم ممالک اپنے انتشار کے سبب اس وقت تباہی کے دہانے پر پہونچ چکے ہیں، غزہ پر اسرائیل ایک ماہ بمباری کرتا رہا، اس کے اطراف دسیوں عرب ممالک ہیں کسی میں جرأت نہیں کہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے آگے بڑھیں، مدد تو دور کنار بعض مسلم ممالک حماس کا صفایا کرنے کے لئے اسرائیل کے ساتھ ساز باز کررہے ہیں، مکہ مدینہ کی دہائی دینے والوں کے گھناؤنے کردار کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی، خود کو اسرائیل کی سب سے بڑی دشمن کہنے والی حزب اللہ جس نے شام میں ہزاروں نہتے سنیوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ ہلاک کیا، آج جب حماس اسے اسرائیل کے خلاف مدد کی دعوت دیتا ہے تو اس پر خاموشی طاری ہے، عراق میں آپسی انتشار اسے ملبہ میں تبدیل کررہا ہے، ہر روز سیکڑوں مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھ ہلاک ہورہے ہیں، پڑوسی ملک میں خود اپنے ہی انتشار برپا کرکے حکومت کو بے دخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

☆☆☆

❑ شریعت و قانون

اسلام میں جرم وسزا کا تصور

محمد اشتیاق علی
ریسرچ اسکالر شعبۂ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مذہب وہ ہوتا ہے جو انسان کو جس چیز کی دعوت دیتا ہے اُس میں دنیا کی انسانیت کی فلاح کے لیئے ہوتا ہے اور جن کاموں سے منع کرتا ہے ان سے اجتناب میں بھی انسانیت کی خیر پوشیدہ ہوتی ہے، مذہب اسلام میں سماج کو گناہوں اور جرم سے پاک وصاف رکھنے کے لئے سماجی قواعد وضوابط واحکام بنائے ہیں ان توڑنے والوں کو مجرم اور اُن کے جرم کے مطابق سزاؤں کو مقرر کیا ہے۔

اسلام میں جرم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

''**الجرائم محظورات شرعیة زجر الله تعالیٰ عنها بحد اوتعزیر** '' [۱] یعنی جرائم وہ شرعی ممانعتیں ہیں جن سے اللہ نے روکا ہے اوران کے کرنے پر حد یا تعزیر سزا متعین کی ہیں۔ اسلام کی نظر میں جرم وہ ممنوعات شرعیہ ہیں جن کے ارتکاب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کا حکم دیا ہے اوران میں سے بعض کے ارتکاب پر حد جاری کی جاتی ہے اور بعض کے ارتکاب پر تعزیر کی جاتی ہے اور بعض کے ارتکاب پر قصاص لیا جاتا ہے۔ [۲]

شریعت اسلامیہ نے جرائم کے علاج کی تین صورتیں بتائی ہیں پہلی قسم حدود کا نفاذ ہے۔ دوسری قسم قصاص اور تیسری تعزیر ہے۔ روکنا۔

(ا) حدود:-

حدود لفظ حد کی جمع ہے اور حد کے لغوی معنی منع کرنا ہے روکنا۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار کو بھی ''حداد'' کہا جاتا ہے چونکہ وہ بھی لوگوں کو اندر داخل ہونے سے منع کرتا ہے۔ شریعت میں مقررہ سزاؤں کو حدود کا نام اس لئے دیا گیا ہے چونکہ حدود بھی ارتکاب جرائم اور اسباب حد کے مانع ہوتی ہے۔ [۳]

حنفیہ کے نزدیک حد کی اصطلاحی تعریف یہ ہے **عقوبة مقررةٌ واجبةٌ حقاً لله تعالیٰ** (حدود مقررہ سزا ہے جو اللہ کے حق کے طور پر دی جاتی ہے۔) [۴]

حدودو کی اقسام:- حد زنا، حد قذف، حد سرقہ (چوری) حد حرابہ (رہزنی) حد شرب خمر حنفیہ کہتے ہیں حدود کی پانچ اقسام ہیں وہ یہ ہیں حد سرکہ، حد زنا، حد شرب، حد سکر، (نشہ چڑھانے کی حد) اور حد قذف رہی بات قطع طریق (رہزنی) کی سو وہ معنی اعم کے اعتبار سے سرقہ کے مفہوم میں داخل ہے۔ حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک مذکورہ بالا پانچ اقسام کے ساتھ دو قسمیں اور بھی ہیں وہ یہ

ہیں حد دقصاص اور حد ردت ۔۵؎

(ا) زنا کی کی تعریف ھو وطؤ الرجل المرأة القبل فی غیر الملک و شبھة (مرد کا عورت کے ساتھ اس کے آگے والے راستے سے وطی کرنا بایں طور کہ وطی ملک یا شبہ ملک سے خالی ہو۔٦؎

زنا کی سزا:-شریعت میں زنا کی تین سزائیں مقرر کی گئی ہیں ا۔جلد (کوڑے مارنا) ۲۔تغریب (شہر بدر کرنا) ۳۔رجم (پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینا۔)۷؎

زنا میں کوڑے مارنے کی سزا قرآن میں دی گئی اور شہر بدر حدیث سے ثابت ہے جو کہ ایک غیر شادی شدہ کو دی جاتی ہے اور شادی شدہ مرد عورت دونوں کو رجم کی سزا دیئے جانے کا ثبوت حدیث سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَة زانیہ (غیر شادی شدہ) عورت اور زانی مرد دونوں میں ہر ایک کو سو کوڑے مارو۸؎ (القرآن، النور-۲)

اس سلسلہ میں حدیث: البکر بالبکر جلد مائة و نفی سنة ۔(کنواری سے کنوارے کی زنا کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ ۹؎

شادی شدہ مرد وعورت کی سزا احدیث میں رجم ہے۔

اِس سلسلہ میں حدیث لایحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰه الا الله وانی رسول الله الا باحدی ثلاث النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینه التارک الجماعه.

(کسی مسلمان کا جو توحید اور رسالت کا اقرار کرتا ہو، کا خون حلال نہیں ہے مگر تین وجہ سے یا تو اِس نے خود کسی کا قتل کیا ہے تو قصاص میں اِس کا قتل کیا جائے گا یا شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا ہو (تو اِس کو رجم کیا جائے گا) یا مرتد ہو گیا ہو اور مسلمانوں کی جماعت سے نکل گیا ہو تو اُس کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔۱۰؎

(۲) قذف:-قذف یا بہتان تراشی سے مراد کسی پر زنا کا الزام لگانا ہے اس کے نسب کا انکار کرنا ہے مکلّف آدمی کا کسی دوسرے آزاد، پاک دامن، بالغ، عاقل کو زنا سے منسوب کرنا یا کسی مسلمان کے نسب کو قطع کرنا قذف ہے۔۱۱؎

اِس کی سزا قرآن میں اِسطرح سے بیان کی ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَداً وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُون

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسّی کوڑے مارو اور اُن کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔۱۲؎

اس طرح سے قذف کی سزا اسّی کوڑے کے ساتھ ساتھ اُس کی گواہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جاتی ہے۔

(۳) سرقہ (چوری): وقت خفیہ سے مراد مال اٹھانے کا ابتدائی اور آخری وقت ہے جب کہ چوری کی واردات دِن کے وقت ہو دن کا وقت عشاء ممتد ہوتا ہے، اگر چوری کی واردات رات کو ہو تو ابتاء میں خفیہ ہو یہاں تک کہ چور اگر رات کو مخفی طور پر داخل ہوا پھر سر عام کھلم کھلے مال لے اُڑے اگر چہ مار کٹائی کے بعد ہی ہو تو استحساناً اِس کا ہاتھ کاٹا جائےگا۔ چونکہ اگر رات میں آخر میں خفیہ ہونے کا اعتبار کرتے تو رات کے وقت ہونے والی چوری کی اکثر وارداتوں میں حد قائم کرنا ممنوع ہوتی اور اکثر وارداتیں مال اٹھانے کے آخر میں

غلبہ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ چونکہ رات کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں مدد کا پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔[۱۳]

شریعت میں سرقہ کی سزا:- شریعت میں سرقہ کی سزا ہاتھ کاٹنے کی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا جَزَاء بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللّهِ

اور چوری کرنے والے کی سزا مرد اور عورت کے دونوں کا ہاتھ کاٹ دو یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے۔[۱۴]

(۴) الحرابہ (ڈکیتی) (رہزن):- ایسا شخص قطع طریق کے ارتکاب سے پہلے محقون الدم (محفوظ الدم) ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی (یعنی وہ شخص یا جماعت جو کسی بھی اسلحہ سے مسلح ہو کو راستے میں چلنے والوں پر غارتگری ڈالے اور بالفعل مال لوٹے بایں طور کہ عین وقت قافلہ کی مدد ممکن نہ ہو۔ وہ قاطع طریق یا رہزن ہے)[۱۵]

رہزنی کی سزا قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے:

إِنَّمَا جَزَاء الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ

جو لوگ اللہ اور اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں زمین سے دور (جلاوطن) کر دیا جائے۔[۱۶]

اس طرح سے شریعت میں ڈکیتی کی چار سزائیں مقرر کی گئی ہیں (۱) قتل کرنا (۲) سولی (۳) مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹنا (۴) جلاوطن کرنا۔

(۵) الشرب (شراب نوشی):- جمہور فقہاء نے خمر اور دوسرے اشربہ میں کوئی فرق نہیں کیا وہ کہتے ہیں:- ہر وہ شراب جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اسکی قلیل مقدار حرام ہے اور وہ خمر کے حکم میں ہے اور پینے والے پر حد واجب ہوگی۔ ان کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر (شراب) حرام ہے''[۱۷]

شراب نوشی کی حد قرآن کریم میں بیان نہیں کی گئی ہے مگر حدیث سے راس کی حد مقرر کی گئی ہے۔ جمہور فقہاء کہتے ہیں: کہ شراب اور نشہ آور کی حد اسّی کوڑے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ''جب کوئی شخص شراب پیتا ہے وہ ہزیان بکتا ہے اور جب ہزیان بکتا ہے تو جھوٹ اور تہمت باندھتا ہے اور تہمت لگانے والے کی حد اسّی کوڑے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ گویا اجماع ہو گیا۔[۱۸]

عہدِ نبویؐ میں شرابی کو چالیس کوڑے مارے جاتے تھے لہٰذا بعض فقہاء نے اسّی کو اس کی حد قرار دیا ہے۔ بعد کے عہد میں مصالح کے پیش نظر خلفائے راشدین نے اس میں اضافہ کیا اور اسّی کوڑے مارے گئے۔ لہٰذا بعض فقہاء نے کہا ہے کہ شراب نوشی کی حد یہی ہے ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ شراب نوشی کی کم از کم سزا چالیس کوڑے ہے اور زیادہ سے زیادہ اسّی کوڑے۔[۱۹]

(۶) ارتداد:- دینِ اسلام میں پھر جانے کو ارتداد کہا جاتا ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ ایک ایسا جرم ہے، جس کی سزا دنیا میں بھی دی جائے گی اور آخرت میں بھی۔[۲۰]

ارتداد کی سزا حدیث میں مقرر کی گئی ہے اور اُس کی سزا قتل کرنا ہے:-

لایحل دم امرئ مسلم یشهد ان لا الٰه الا الله وانی رسول الله الا باحدی ثلاث النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینه التارک الجماعه.

کسی مسلمان کا جو توحید اور رسالت کا اقرار کرتا ہو، کا خون حلال نہیں ہے مگر تین وجہ سے یا تو اِس نے خود کسی کا قتل کیا ہے تو قصاص میں اِس کا قتل کیا جائے گا یا شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا ہو (تو اِس کو رجم کیا جائے گا) یا مرتد ہو گیا ہو اور مسلمانوں کی جماعت سے نکل گیا ہو تو اُس کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔[۲۱]

(۷) بغاوت (البغی):- فقہاء نے بغاوت کی تعریف کی ہے:

امام مالک کے نزدیک تسلیم شدہ امام کی اطاعت سے روگردانی کرنا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک امام برحق کی اطاعت کے بغیر کسی حق سے روگردانی کرنا۔ امام شافعی کے نزدیک امام کی مخالفت کرنا اس کے خلاف خروج کر کے یا اس کی اطاعت نہ کر کے اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک امام کے خلاف اگر چہ وہ عدل پر قائم نہ ہو طاقت کے ساتھ خروج کرنا بغاوت ہے[۲۲]

اسلامی حکومت کے خلاف خروج یعنی بغاوت کی حد مقرر کی گئی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے جیسا کی فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتَّى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[۲۳]

(۲) قصاص:-

مذہب اسلام میں قصاص کی دفعات مقرر کی گئی ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کی جان ک احترام کریں اور معاشرے میں خون خرابہ نہ ہو۔ قصاص کے تعلق سے فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِيْ الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَى بِالْأُنثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاء إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيْمٌ.

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھارے لئے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس سے آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا۔ غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا اور عورت اِس جرم کی مرتکب ہو تو اِس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا ہاں اگر قاتل کے ساتھ بھائی کچھ نرمی کے لئے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خون بہانے کا تصفیہ ہونا چاہئیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اِس پر بھی جو زیادتی کرے اِس کے

لیئے دردناک سزا ہے۔۲۴

قتل کی اقسام:-شریعت میں قتل کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں جن میں تین خاص ہیں۔

(۱)قتل عمد: قاتل کا پورے قصد وار ارادے سے مقتول کو مارنا کہ وہ مرجائے اس کی تین شرائط ہیں (۱) مقتول کا زندہ انسان ہونا (۲) مقتول کی جان قاتل کے فعل سے نکلے (۳) قاتل مقتول کی جان لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

(۲)قتل شبہ عمد:-قاتل نے مقتول کو قصدوار ارادے سے مارا ہولیکن اس کا مقصد جان لینا نہ ہو اِس کی تین شرائط ہیں (۱) مقتول قاتل کے فعل سے مرا ہو (۲) قاتل نے مقتول پر زیادتی کا ارادہ کیا ہو (۳) موت اور سبب موت کے درمیان تعلق ہو۔

(۳)قتل خطاء:-قاتل نے غلطی (خطا) سے مقتول کی جان لے لی ہو۔جیسے اُس نے شیر مارنے کے لیے گولی چلائی اور وہ کسی انسان کو لگ گئی۔۲۵

سزا:- قتل عمد کی سزا وہ بدلہ ہے جو کسی نفس پر ظلم کے بدلے میں مرتب ہوتا ہے اور قتل عمد کے لئے کئی سزائیں ہیں ایک اصلی۔ایک بدل اور تبعی۔ ۲۶

(۱) پہلی سزاء اصلی جو متفق علیہ ہے وہ قصاص ہے (۲) دوسری دیت اور تعزیر جو متبادل سزا ہے (۳) تیسری تبعی سزا میراث اور وصیت سے محرومی۔

قتل شبہ عمد:-اِس کی تین سزائیں ہیں اصل، بدل، اور تبعی۔

اصلی سزا:- ایک دیت اور ایک کفارہ دوسری متبادل تعزیر (دیت کے ساقط ہونے) تیسری میراث اور وصیت سے محرومی۔

قتل خطاء:-اِس میں کی دو سزائیں ہیں اصلی اور وہ دیت اور کفارہ ہے اور تبعی وہ میراث اور وصیت سے محرومی۔۲۷

اسلام میں جس طرح کسی کو جان سے مار دینے کی سزا مقرر کی ہے اسی طرح زخم یا کسی جسم کے عضو کو تلف کر دینے کی سزا بھی قرر کی گئی ہے اور اِس کی سزا قصاص دیت یا عفو ہے۔۲۸

تعزیرات:-

وہ سزائیں جو شرعاً مقرر نہیں ہیں اور اِن کی تحدود و تعین کا اختیار قاضی یا حاکم وقت کو سونپ دیا گیا ہے کہ وہ زمان و مکان کا اور اشخاص کے حالات اور جرائم کی نوعیت کو سامنے رکھ کر اپنی صوابدید کے مطابق تعزیراتی سزا دے۲۹

تعزیری سزائیں:-زجر توبیخ، قید و بند مار پٹائی، احالی تاوان، حالات اور جرائم کے پیش نظر سیاستہ قتل بھی ہے، مثلاً ملکی امن وامان، جاسوسی، لواطت، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے پر قتل بھی بطور تعزیر روا ہے۔۳۰

تعزیر کی حد:-شریعت نے مختلف جرائم پر تعزیر کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس نے اس کی تاکید کی ہے کہ کسی کو اتنی تعزیر کی جائے جتنی حقیقتاً ضرورت ہو غیر ضروری سختی اور بے جا تشدد اِس کے مقصد کو فوت کر دے گا، چناں چہ ایسی تعزیر جس سے مجرم کا کوئی عضو تلف ہو جائے یا اس کی افادیت جاتی رہے یا اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائز نہیں ہے۔۳۱

تعزیری جرائم:-گالی گلوچ کرنا، چغل خوری جاسوسی، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی خبر پھیلانا۔کسی کے گھر میں بلا اجازت گھسنا۔رشوت کا لین دین۔جعلی نوٹ چھاپنا۔آفیسر کا اپنے عہدہ کا غلط استعمال کرنا توہین عدالت کا مرتکب ہونا ناپ تول میں کمی بیشی کرنا۔

☆☆☆

❑ تاثرات

دارالصلح والخیر، گودھرا

نوٹ: یکم مارچ تا تین مارچ راقم گودھرا میں تھا، عوامی اجلاس کے علاوہ علماء ونوجوانان، دانشوروں اور خواتین کی نشستوں میں خطابات ہوئے، اس دوران ''دارالصلح والخیر'' میں جانا ہوا، دارالصلح کی چہل پہل، کارکردگی اور کارکنان کے اطمینان کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، راقم عرصہ سے اس طرح کے اداروں جسے دارالصلح کہیے یا Counselling Center کے قیام کا داعی ومؤید رہا ہے، اس ادارے کے تجربات سن کر اور کارکردگی دیکھ کر احساس ہوا کہ اس کا مختصر تعارف وکارکردگی قارئین کی خدمت میں پیش کی جائے اور پھر یہ درخواست دوہرائی جائے کہ ایسے کاؤنسلنگ سینٹر اگر مسلمانوں کے علاقوں میں قائم ہوجائیں تو نہ صرف ان کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں بلکہ ضیاعِ وقت وضیاع مال سے بھی وہ محفوظ ہوسکتے ہیں، یہ سینٹر غیر مسلموں کے لیے خاموش دعوتی مرکز بھی ثابت ہوسکتے ہیں، ان میں اگر لائبریری قائم ہو تو وہ نوعمر بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی تربیت کا سبب بن سکتی ہے اور اس کے ذریعہ ان کو جرائم کے ارتکاب اور آوارگی ووقت گذاری سے بچایا جاسکتا ہے، یہ سینٹر بہت کم وقت اور بہت کم صرفہ سے قائم ہوسکتے ہیں، انھیں مسجدوں میں بھی قائم کیا جاسکتا ہے یا مسجدوں کے احاطہ میں اس کے لیے الگ ایک حصہ بنایا جاسکتا ہے، زمین کی خریداری سے بچنے کے لیے مسجدوں پر بالائی منزلیں تعمیر کی جاسکتی ہیں۔

یہ بہت بڑا کارخیر ہے، اس کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے، بہت سے مسائل اور جھگڑے محض آپسی گفتگو یا عادلانہ ومنصفانہ اور غیر جانبدارانہ ومخلصانہ افہام وتفہیم کی کوششوں سے حل ہوجاتے ہیں، مجھے ایک علاقہ کا ایک واقعہ بتایا گیا کہ عام شکایت کا دن تھا، وہاں کا ایم ایل اے غیر مسلم تھا، وہ بھی بیٹھا تھا، جب کوئی غیر مسلم اپنی شکایت لے کر آتا تو وہ ایم ایل اے فریقین کو بلاتا اور مصالحت کی کوشش کرتا، رفع دفع کرتا اور مقدمات کے نقصانات سمجھا کر معاملہ سلجھانے کی کوشش کرتا، اس کے برخلاف کوئی مسلمان شکایت کرتا تو پولیس سے ڈانٹتے ہوئے کہتا کہ ان کی شکایت کیوں نہیں درج کرتے، کیوں دوڑاتے ہو ان کو، ان کی ایف آئی آر لکھو اور مقدمہ بناؤ جلدی، اس ملک کی یہ صورت حال ہے، ایسے میں ان کاؤنسلنگ سینٹرز کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، پھر یہ کہ ان پر حکومت کو بھی وہ اعتراض نہیں ہوسکتا جو وقتاً فوقتاً بعض متعصب ارکان حکومت ''دارالقضاء'' کے نام وقیام پر کرتے رہتے ہیں اور ان کو متوازی عدالت قرار دیتے ہیں، میں گودھرا کے اس ادارے اور اس کے منتظمین وکارکنان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ اس تجربہ سے فائدہ اٹھائیں اور یہ ادارے قائم کریں، اس ادارے کے کارکنان نے ذیل میں جو کارکردگی پیش کی ہے فی الحقیقت وہ ان کے مشاہدات اور خوش آئند امیدوں اور پہلوؤں کی نیز اب تک کی کارکردگی کی بس ایک کاغذی جھلک ہے، ورنہ ان کا کام دراصل اسے سے بہت زیادہ ہے، اور اس کام پر ان لوگوں کا اطمینان بھی قابل دید وشنید ہے، یہ مقدمات فیصل بھی کرتے ہیں، مصالحت بھی کراتے ہیں، فریقوں کے وکیل وامین بھی بن جاتے ہیں، لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے ہیں، تھانے اور ایس پی اپنے یہاں سے خود فریقین کو بسا اوقات یہاں بھیجتے ہیں، ضرورت ہے کہ اس پر امید تجربہ اور تعمیری کام کو فروغ دیا جائے اور امت کو بہت سے مسائل سے نجات دلائی جائے''۔ ذیل میں اس ادارے کا تعارف خود اس کے ذمہ داروں کے قلم سے پیش کیا جاتا ہے۔

والسلام

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نحمده و نصلی علی رس وله الکریم امابعد!

قال الله تعالیٰ : والصلح خیر (النساء:۱۲۸)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الصلح جائز بین المسلمین الا صلحا أحل حراماً أو حرم حلالاً (سنن ابی داؤد:۳۵۹۴)

سماجی غلط فہمیاں اور گھریلو جھگڑے آپسی مشورے سے حل ہوں اس عظیم مقصد کو لے کر ۱۸/ جنوری ۲۰۱۹ء کو شہر گودھرا میں ''دارالصلح والخیر'' کے نام سے ایک ادارے کا وجود عمل میں آیا، ادارے کا اہم مقصد کسی بھی قسم کے مذہبی بھید بھاؤ کے بغیر سماجی مسائل کو حل کرنا ہے، اس کارگردگی کی وجہ سے ایک سال کے دورانیہ میں ادارے کو بہت سراہا گیا ہے۔ فلله الحمد علی ذلك.....

ادارے میں ۳۱/ دسمبر ۲۰۱۹ء تک گھریلو، وراثت، آپسی جھگڑوں وغیرہ کے قسم کی ۸۱۰ عرضیاں دار ہوئی ہیں، جن میں اندرونی اور بیرونی طور پر ۴۴۵ مسائل بحمد اللہ حل ہوئے ہیں ادارے میں مسلمان ہی نہیں؛ بلکہ برادران وطن کے بھی مقدمے دائر ہوتے ہیں، ان کو ملکی قوانین اور بھائی چارے کی روشنی میں سمجھایا جاتا ہے، بحمد اللہ اب تک ان کے ۳ مقدمات حل ہوئے ہیں۔ ادارہ مصالحت میں شریعت کے ساتھ ساتھ ملکی دستور کو مدنظر رکھتا ہے، جس کے نتیجے میں پولیس افسران، وکلاء وغیرہ بارہا ادارے میں تشریف لاکر حوصلہ افزائی کرتے ہیں، نیز ہائی کورٹ کے ایک وکیل صاحب نے یہاں تک کہا تھا کہ اگر کورٹ کے حساب سے ایک مقدمے کی کم از کم ۲۰۰۰۰ روپے بھی فیس مانی جائے تو امت کے تقریباً ۹۰ لاکھ روپے کا فائدہ ہوا اور ضیاع وقت اور ذہنی تشویشوں سے بچاؤ اس کے علاوہ ہے۔

ادارہ مصالحت کے ساتھ ساتھ رفاہی کاموں میں بھی سرگرم ہے، جیسے.....

ادارہ بلڈ ڈونیشن کے ذریعہ غریب مریضوں کو خون کی بوتلیں فراہم کرتا ہے، ادارے نے اب تک غریب مریضوں کی خدمت میں تقریباً ۱۰۰۰ یونٹ خون فراہم کیا ہے، جس میں سے ۸۵۸ یونٹ خون برادران وطن کی خدمت میں پیش کیا ہے، بعض مرتبہ مریضوں کی ایمرجنسی ضرورت پوری ہو اس غرض سے دیررات کو بھی ادارہ ان کی حاجت پوری کرتا ہے۔

ادارہ میں ہر قسم کے آن لائن، آف لائن فارم، نیز پاسپورٹ، ووٹر کارڈ ویریفکیشن وغیرہ جیسے سرکاری کاغذات کی سہولت مفت فراہم کی جاتی ہے، جن کی تعداد تقریباً ۱۲۰۰۰ سے متجاوز ہے، اگر ایک فارم کا کم از کم ایک سو روپے خرچہ مان لیں تو امت کے تقریباً ۱۲ لاکھ روپے کا فائدہ ہوا اور کچہریوں کے چکر، ضیاع وقت اور ملازمین کی منت سماجت سے چھٹکارا اس کے علاوہ ہے۔ ادارے کے اوپر والے منزلہ پر ''مولانا آزاد سدبھاونا لائبریری'' ہے، جس کا مقصد نئی نسل میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنا ہے، جس میں تقریباً ۱۷۰۰ سے زائد مختلف علوم و فنون کی کتابیں ہیں، اس کے علاوہ مختلف قسم کے روزنامہ، ہفت روزہ، ماہانہ رسائل بھی آتے ہیں، لائبریری میں روزانہ ۲۰۰ کے قریب افراد کی آمد و رفت رہتی ہے اور ۲۳۴ ممبران اس کے علاوہ ہیں۔

ادارہ شہر گودھرا کے مشہور علماء کرام جیسے مفتی ہارون صاحب، مفتی حسن صاحب، مولانا یوسف صاحب، مولانا اقبال صاحب، مولانا عمران صاحب وغیرہ کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

ادارے کا پورا خرچ شہر گودھرا کے بڑے کاروباری، سخاوت میں بے مثال حاجی فردوس کوٹھی صاحب برداشت کرتے ہیں، ادارے کے علاوہ اور بھی کئی رفاہی کاموں میں آپ پیش پیش رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور دنیا و آخرت میں انھیں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خدام کو اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہر قسم کے شر و رفتن سے بچائے اور ادارے کو دن دونی رات چوگنی ترقیات سے مالا مال فرمائے۔

از منتظمین دارالصلح والخیر

☆☆☆

وزیر داخلہ کے بیان پر مختلف تنظیموں کی طرف سے قانون میں ترمیم کے عوامی مطالبات

وزیر داخلہ کا، این پی آر (National Population Register) کے سلسلے میں ۱۲/ مارچ ۲۰۲۰ء کو دیا جانے والا بیان۔

(وزیر داخلہ کے بیان کے مطابق ۲۰۰۳ء کے رولز کو لانے کے لیے

(Registration of Citizens & Issue of National Identity Cards) میں ترمیم مطلوب ہے۔)

وعدہ کے احترام میں ترمیم مطلوب ہے	موجودہ رول	وزیر داخلہ کا تبصرہ
رول ۳ (۵) کی منسوخی مطلوب ہے	رول ۳ (۵) لوکل رجسٹر آف سٹیزن لوگوں کی معلومات پر مشتمل ہوگا جو کہ عوامی رجسٹر (Population Register) سے صحیح تصدیق کے بعد لی جائے گی۔	
رول ۴ (۳) کی منسوخی مطلوب ہے	رول ۴ (۳) لوکل رجسٹر آف سٹیزن کی تیاری اور شمولیت کے مقصد سے عوامی رجسٹر میں ہر خاندان اور افراد سے متعلق جمع کی گئی معلومات کی تصدیق اور جانچ پڑتال لوکل رجسٹر کی مدد سے کی جائے گی، جس کی ایک یا دو افراد کے ذریعہ مدد کی جائے گی جیسا کہ سٹیزن رجسٹریشن کے رجسٹرار جنرل کے ذریعہ متعین کیا جائے۔	این پی آر کا استعمال کسی شہری کو ''ڈاؤٹ فل'' (مشکوک) کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا۔
پاپولیشن رجسٹر کے حوالے کی منسوخی مطلوب ہے	رول ۴ (۴) تصدیقی عمل کے دوران ایسے اشخاص کی تفصیل جن کی شہریت مشتبہ ہے، کو مقامی رجسٹر کے ذریعہ آگے کی جانچ کے لیے آبادی رجسٹر میں مناسب تبصرہ کے ساتھ درج کیا جائے گا اور تصدیقی عمل کے ختم ہوتے ہی فرد یا خاندان کو مخصوص خاکے (پروفارما) کے ذریعہ آگاہ کر دیا جائے گا۔	
رول ۷ (۲) کی منسوخی مطلوب ہے	رول ۷ (۲) اس مدت کے دوران جس کو کہ پاپولیشن رجسٹر تیار کرنے کے لیے متعین کیا گیا ہے، گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ جس گھر کا وہ سرپرست ہے اس سے متعلق، رول ۳ کے ذیلی رول ۳ کی تصریح کے مطابق اہل خانہ کے نام ان کی تعداد اور دیگر تفصیلات کی صحیح جانکاری فراہم کرے۔	اگر کسی شخص کے پاس کوئی معلومات نہیں ہے تو اس کو دینا ضروری نہیں ہے۔
اس رول سے رول نمبر ۷ سے منسوخ کیا جائے یا خاص طور پر رول ۷ (۲) کو اس رول سے خارج کیا جائے۔	رول ۷ ا مختلف شکلوں میں تعزیری نتائج، رول نمبر ۵، ۷، ۸، ۱۰، ۱۱ اور ۱۴ کے احکامات میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کی سزا تاوان کی شکل میں ہوگی جس کی مقدار ایک ہزار روپیہ تک ہو سکتی ہے۔	

❑ گوشۂ ادب

بجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو

کلیم عاجز

کلیجہ تھام لو، رودادِ غم ہم کو سنانے دو
تمہیں دُکھا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دِکھانے دو

اسی کے دم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو

یہ بجلی اِس دل خوابیدہ کو اک تازیانہ ہے
مری محرومیوں پر آسماں کو مسکرانے دو

اُسی سے تم کسی کی زُلف کی روداد سن لینا
اُدھر دیکھو وہ دیوانہ چلا آتا ہے آنے دو

سنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چھری لاؤ ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو

نہ داغ آئے گا اپنے دامنِ حسنِ طبیعت پر
وفا پر میری جو تہمت لگاتے ہیں لگانے دو

زمانہ صبر کر لیتا ہے عاجزؔ ہم بھی کرلیں گے
خلش دل کی مٹالینے کو دو آنسو بہانے دو

☆☆☆